احیاء الاسلام

اعنی

تجدید علم الکلام

و

تصحیح تفاسیر

احسن الکلام

در اثبات اصول و عقائد اسلام بدلائل عقلیہ و رد الحاد و اشتراکیت
ببراہین قطعیہ۔ توضیح معارف قرآن و تفصیل اعجاز بیان و
تغلیط مسالک مفسرین در ترجمہ کتاب مبین

از

سید علی صفدر

۱

تجدید علم الکلام

اس کتاب میں علم کلام کی تجدید اور تہذیب متعدد جہات سے کی گئی ہے۔

۱۔ اردو میں حتی المقدور بیان کو آسان کیا ہے۔

۲۔ طرز استدلال کی اصلاح کی ہے اور نئے دلائل جابجا وارد کئے ہیں۔

۳۔ کتب کلامیہ میں بہت سے ایسے مسائل فلسفی کی بحث ہے جن کا اصول دین کے ثبوت سے براہ راست تعلق نہیں' ان کو ساقط کیا ہے۔

۴۔ کتب کلامیہ میں دو بڑے نقص عموماً پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ مصنف اکثر مسائل کی بحث میں متضاد اقوال پیش کرتا ہے۔ اپنا مختار ظاہر نہیں کرتا۔ اس طرح طلبہ کو حیرانی میں چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مباحث میں قول باطل پر ایسے دلائل لاتا ہے جن میں دقیق مغالطات پنہاں ہیں۔ جن کا ادراک طالب علم کی بساط کے باہر ہے۔ نتیجہ یہ کہ طالب علم بجائے اصول دین کا یقین حاصل کرنے کے متشکک ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب ان عیوب سے پاک ہے۔

۵۔ چونکہ عقائد اسلام سے بحث ہے۔ ضروری ہے کہ ہر عقیدہ پر عقلی بحث کے بعد قرآن مجید کا قول فیصل پیش کیا جائے۔ عموماً کتب کلامیہ میں یہ کمی ہے۔ یہاں اسکو پورا کیا ہے۔

۶۔ اس کمی کی وجہ یہ ہوئی کہ تفاسیر کی رو سے آیات قرآن متعدد معانی کی حامل اور آیاہت ہی سے متضاد عقائد کی تائید حاصل۔ ان اغلاط کو رفع کرنے میں ضوابط تفسیر پر طویل مباحث ضروری ہوئے۔ یہاں تک کہ علم کلام نے یہاں تفسیر قرآن مجید کی صورت اختیار کی ہے۔

اہل علم سے التماس

اس کتاب کی خاص غرض برگشتہ مسلمانوں کو راہ راست پر لانا اور عموماً منکرین پر دین کی حجت قائم کرنا ہے۔

مغربی تعلیم اور تمدن سے تعلیم یافتہ مسلمان عقائد دین کے منکر ہوئے ہیں۔ علاوہ بریں مسلمانوں میں شرک عام ہے۔ اسلام معرض زوال و خطر میں ہے۔

مختصر یہ کہ جن احوال میں ہم مبتلا ہیں وہ اہل نظر پر عیاں ہیں۔

اصلاح حال ضروری ہے اور دشوار۔ اس لئے اہل علم کی اجتماعی کوشش کی طالب ہے۔

مصنف کتاب اُن سے قلمی اعانت کا خواستگار یعنی ان کے تبصرہ و تنقید کا امیدوار ہے۔ خواہ ان کو اخبارات میں شائع کیا جائے خواہ مصنف کو بھیجدیا جائے۔

سید علی صفدر
۳- پی جوبلی بلڈنگ۔ سانکلی اسٹریٹ
بمبئی ۸

فہرست مضامین جلد اول

تصحیح تفاسیر کا بیان

مفسرین قرآن سے کتاب اللہ کے متعلق دو قسم کی غلطیاں ہوئیں جن کے سبب مطالب آیات تک پہونچنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا، پہلی قسم میں وہ غلطیاں ہیں جو قرآن مجید کے طرز بیان اور معنویت کے متعلق ہیں۔ دوسری قسم میں وہ غلطیاں ہیں جو طریقہ تعبیر میں کی ہیں۔ تابعین نے کتب تفاسیر کی ابتدا کی اور تعبیر کی بنا حدیث و روایت پر رکھی۔ جن میں وہ تعبیریں تھیں جو الفاظ قرآن کی دلالت کے مغائر تھیں۔ اس لئے آیات کو ناقص الدلالت ماننا پڑا۔ حالاں کہ وہ اپنی مراد پر قطعی الدلالت ہیں۔ چوں کہ ایک آیت کی متعدد تفسیریں روایات سے ملیں، ان کو صحیح مانا تو آیات قرآن کو مبہم قرار دیا۔ حالاں کہ وہ جامع و مانع ہیں۔ ایک ایک آیت کی تفسیر جدا جدا ملی تو آیات کو بے ربط سمجھا اور قرآن مجید کو نامربوط کلام قرار دیا۔ حالاں کہ آیات میں ربط ہے۔ جو کچھ تفسیریں ہوئیں ان میں عامیانہ مطالب تھے۔ اس لئے قرآن مجید کو معنی کے اعتبار سے ایسا کلام قرار دیا جیسا کہ عوام عرب کا کلام ہوتا تھا۔ حالاں کہ آیات قرآن کثیر الدلالت ہیں اور معارف حکمیہ ہیں پس جس عینک سے مفسرین نے دیکھا اُسے عمارت اوندھی نظر آئی۔ اب صحیح تعبیر کیونکر ہوتی۔

دوسری قسم۔ اصول دین (ایمان باللہ۔ ایمان بالرسالت۔ ایمان بالآخرۃ) پر قرآن مجید کی تمام تعلیم متفرع ہے۔ لہذا آیات کی تعبیر اصول دین کے انس کے ساتھ واجب ہے۔ مفسرین نے اکثر آیات کی تفسیر ایسی کی جو ان اصول کے منافی ہے۔ علاوہ بریں تعبیر کلام کا قاعدہ یہ ہے کہ قرائن حالی اور مقالی سے کلام کی مراد معین کی جائے۔ ربط آیات سے انکار کر کے قرائن مقالی کا خاتمہ کر دیا۔ اور اصول دین کو نظر انداز کر کے قرائن حالی کو ترک کیا۔ اب صحیح مراد تک کیونکر پہونچتے۔

اس کتاب میں ان تمام غلطیوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔ تفصیل کتاب میں دیکھئے۔

قرآن مجید کے ۱۱۴ سورتیں بہ ترتیب نزول

نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	تعداد آیات	ابتدائے نزول	کیفیت
۱	الفاتحہ	مکی	۶ یا ۷	۲۳ رمضان سنہ ۱۳ قبل ہجرت	
۲	العلق / اقرا	”	۱۹ یا ۲۰	نصف اول العلم تک ۵ ربیع الاول سنہ ۱۳ ق م بقیہ تین ماہ بعد	
۳	القلم / نون	”	۵۲		
۴	المزمل	”	۱۸ یا ۱۹ یا ۲۰		ان ربک یعلم سے آخر تک یعنی آخری آیت پندرہ برس بعد مدینہ میں نازل ہوئی
۵	المدثر	”	۵۶ یا ۵۵		
۶	اللھب / المسد	”	۵		
۷	التکویر	”	۲۹		
۸	الاعلیٰ	”	۱۹		
۹	الیل	”	۲۱		
۱۰	الفجر	”	۲۹ یا ۳۰ یا ۳۲		
۱۱	الضحیٰ	”	۱۱		
۱۲	الانشراح	”	۸	ابتدائے سال چہارم از بعثت	
۱۳	العادیات	”	۱۱		

نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	تعداد آیات	ابتدائے نزول	کیفیت
۳۵	ص	مکی	۸۵		
۳۶	الاعراف	"	۲۰۶		آیات ۱۶۳ تا ۱۶۷ مدنی
۳۷	جن	"	۲۸		
۳۸	یٰس	"	۸۳ یا ۸۲		
۳۹	الفرقان	"	۷۷		آیات ۶۳ تا ۷۷ مدنی
۴۰	فاطر الملائکہ	"	۴۵ یا ۴۶		
۴۱	مریم	"	۹۸ یا ۹۹		
۴۲	طٰہٰ محیم	"	۱۳۵		
۴۳	الواقعہ	"	۹۷		آیات ۱۳۔۱۴ اور ۸۱ ۸۲ مدنی
۴۴	الشعرا الجامعہ	"	۲۲۷		آیات ۲۲۴ تا ۲۲۷ مدنی
۴۵	النمل سلیمان	"	۹۵		آیات ۵۲ تا ۵۵ اور آیت ۸۴ مدنی
۴۶	القصص طسم	"	۸۸		آیات ۷۵ تا ۸۳ مدنی
۴۷	بنی اسرائیل اسرا	"	۱۱۱		آیات ۵۴ تا ۹۶ مدنی
۴۸	یونس	"	۱۱۰		
۴۹	ہود	"	۱۲۳		آیت ۱۱۴ مدنی
۵۰	یوسف	"	۱۱۱		
۵۱	حجر	"	۹۹		
۵۲	الانعام	"	۱۶۷		۱۵۲ تا ۱۵۴ مدنی
۵۳	الصافات	"	۱۸۲		
۵۴	لقمان	"	۳۴		
۵۵	سبا	"	۵۵		آیت ۶ مدنی

نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	تعداد آیات	ابتدائے نزول	کیفیت
۱۴	الماعون	مکی	۶ یا ۷		
۱۵	الکافرون	"			
۱۶	الفیل	"	۴ یا ۵		
۱۷	الفلق	"	۵		
۱۸	الناس	"	۶ یا ۷		
۱۹	الاخلاص	"	۴ یا ۵		
۲۰	النجم	"	۶۱ یا ۶۲		
۲۱	عبس الاعمیٰ	"	۴۰ یا ۴۱ یا ۴۲		
۲۲	القدر	"	۵ یا ۶		
۲۳	الشمس	"	۱۵ یا ۱۶		
۲۴	البروج	"	۲۲		
۲۵	التین	"	۸		
۲۶	القریش	"	۴ یا ۵		
۲۷	القارعہ	"	۸ یا ۱۰ یا ۱۱		
۲۸	القیامۃ	"	۳۹ یا ۴۰		
۲۹	ھمزہ	"	۹		
۳۰	المرسلات	"	۵۰		
۳۱	ق الباسقات	"	۴۵		آخری آیات ۳۸ تا مدنی
۳۲	البلد	"	۲۰		
۳۳	الطارق	"	۱۶ یا ۱۷		
۳۴	القمر اقتربت	"	۵۵		آیات ۴۵ تا مدنی

نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	تعداد آیات	ابتدائے نزول	کیفیت
۷۷	النبا / التساول المعاد	مکی	۴۱		
۷۸	النازعات	"	۴۶		
۷۹	الانفطار	"	۱۹		
۸۰	الانشقاق	"	۲۵		
۸۱	الروم	"	۶۰		آیہ ۱۷ مدنی
۸۲	العنکبوت	"	۶۹		
۸۳	التطفیف	"	۳۶		
۸۴	البقر	مدنی	۲۸۷		
۸۵	الانفال	"	۷۵		
۸۶	ال عمران	"	۲۰۰		
۸۷	الاحزاب	"	۷۳		
۸۸	الممتحنہ	"	۱۳		
۸۹	النسار	"	۱۲۰		
۹۰	الزلزل	"	۹		
۹۱	الحدید	"	۲۹		
۹۲	القتال محمد	"	۴۰		آیہ ۱۳ مکی
۹۳	الرعد	"	۴۷		آیہ ۱۳ مکی
۹۴	الرحمٰن	"	۷۸		
۹۵	الدہر / الانسان	"	۳۱		
۹۶	الطلاق	"	۱۲		
۹۷	البنیہ / لم یکن	"	۹		

نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	تعداد آیات	ابتدائے نزول	کیفیت
۵۶	زمر / الغرف	مکی	۷۵		آیت ۵۳ مدنی
۵۷	المومن / الغافر۔ الطول	"	۸۶		آیات ۳۵۔۳۶ مدنی
۵۸	حم سجدہ / فصلت	"	۵۴		
۵۹	الشوریٰ / حم عسق	"	۵۳		آیات ۲۳ تا ۲۶ مدنی
۶۰	الزخرف	"	۸۹		آیت ۴۵ مدنی
۶۱	الدخان	"	۵۹		
۶۲	الجاثیہ / الدہر۔ الشریعہ	"	۳۷		
۶۳	احقاف	"	۳۵		آیات ۱۰۔۱۵۔۳۵ مدنی
۶۴	الذاریات	"	۶۰		
۶۵	الغاشیہ	"	۲۶		
۶۶	الکہف	"	۱۱۱		آیت ۲۸ مدنی
۶۷	النحل / النعیم	"	۱۲۸		
۶۸	نوح	"	۳۰		
۶۹	ابراہیم	"	۵۴		آیہ ۲۸ مدنی
۷۰	الانبیاء	"	۱۱۲		
۷۱	المومنون / قد افلح	"	۱۱۹		
۷۲	السجدہ / المضاجع	"	۳۰		آیات ۱۸ تا ۲۰ مدنی
۷۳	الطور	"	۴۹		
۷۴	الملک / تبارک	"	۳۱		
۷۵	الحاقہ	"	۵۲		
۷۶	المعارج	"	۴۴		

توضیحات

۱۔ سورتوں کی یہ ترتیب نزول فی الجملہ درست ہے۔

صاحب ملل و نحل نے روایت کی ہے کہ مصحف امام جعفر صادق میں سورتوں کی یہ ترتیب تھی۔ علاوہ بریں قرآن مجید کی تالیف میں خود ایسی صنعتیں ہیں جس سے اس کے اجزا کا مقدم و موخر ہونا معلوم ہو سکتا ہے۔ ان کی تفصیل ہم نے آگے بیان کی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے قرآن مترجم میں یہی ترتیب نزول بیان کی ہے۔

۲۔ سورتوں میں آیات کی تعداد کے بارہ میں اختلاف کیا گیا ہے۔

۳۔ ہم نے آیات کے حوالے سورہ کے نام اور عشرہ آیات کے ذکر سے بیان کئے ہیں۔ مثلاً ایک آیت کا حوالہ $\frac{\text{آل عمران}}{9}$ ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ آل عمران کی آیات کے نویں عشرہ میں یہ آیت ہے۔ یعنی آیات ۸۱ تا ۹۰ کے درمیان۔ اسی طرح $\frac{\text{مائدہ}}{18}$۔ وہ آیت مائدہ کی ۱۷۰ تا ۱۸۰ آیات کے مابین ہے۔

مشکل الفاظ کی شرح

کتاب کے آخر میں دی گئی ہے۔ الفاظ حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دیے ہیں۔

نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	تعداد آیات	ابتدائے نزول	کیفیت
۹۸	الحشر	مدنی	۲۴		
۹۹	النصر	״	۳		
۱۰۰	النور	״	۶۴		آیات ۱۱-۱۲ اور ۱۹ ۲۴ مدنی. باقی مکی
۱۰۱	الحج	״	۷۸		
۱۰۲	المنافقون	״	۱۱		
۱۰۳	التکاثر الدین	״	۸		
۱۰۴	المجادلہ التظاہر	״	۲۲		اول دس آیات مکی باقی مدنی
۱۰۵	الحجرات	״	۱۸		
۱۰۶	التحریم	״	۱۲		
۱۰۷	الصاف الحواریین	״	۱۴		
۱۰۸	التغابن	״	۱۸		
۱۰۹	الجمعہ	״	۱۱		
۱۱۰	الفتح	״	۲۹		
۱۱۱	الکوثر	״	۴		
۱۱۲	التوبہ الفاضحہ - برائت	״	۱۳۰		
۱۱۳	العصر	״	۳		
۱۱۴	المائدہ	״	۱۲۳		

کو اکا دکا نقل کیا تو اس سے غلط باتیں داخل ہوگئیں اور حق و باطل میں التباس ہوگیا۔ علامہ سیوطی کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ تفسیر وہی درست ہے جو حدیث یا اقوال صحابہ کے مطابق ہو۔ ورنہ کم ازکم تابعین کے قول سے مؤید ہو باقی جو کچھ لوگوں نے اپنے غور وفکر سے لکھا وہ اعتبار کے قابل نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ قرآن مجید کا بیان جامع و مانع نہیں ہے یعنی وہ ایسا بیان نہیں جس کے الفاظ مراد پر قطعی دلالت کرتے ہوں اسطرح کہ دوسرے معنی کا احتمال نہ رہے۔ خلاصہ یہ کہ قرآن مجید کا بیان ناقص الدلالت ہے۔

صحابہ کے اقوال کو اس فرض پر معتبر قرار دیا کہ انھوں نے نبی کریمؐ سے یہ باتیں معلوم کی ہوں گی۔ لیکن تفسیر آیات پر صحابہ کے اقوال بکثرت ایک دوسرے کے مخالف اور متضاد بھی ہیں اس لئے ان میں سے بعض کا باطل ہونا عیاں ہے۔ لہٰذا یہ فرض باطل ہے کہ صحابہ کے اقوال نبی کریمؐ کی تعلیم کے مطابق ہیں۔

تفسیر بالحدیث کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ اس طرز تفسیر سے یہ لازم آیا کہ قرآن مجید کی آیات جامع و مانع نہیں ہیں کہ الفاظ معنی پر قطعی طور سے دلالت کریں اور نظر کرنے والا غور وفکر سے صحیح مراد تک پہنچ جائے بلکہ حدیث سے جو مراد معلوم ہو وہی آیت کا مطلب ہے۔ خواہ آیت کے الفاظ اس معنی پر دلالت کریں یا نہ کریں۔ چنانچہ ان معتبر مفسرین نے بہت سی آیات کی تفسیر اس وضع پر نقل کی کہ قرآن مجید کے الفاظ کچھ کہہ رہے ہیں اور تفسیر کچھ اور کہہ رہی ہے، مثلاً :-

۱۔ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین میں اُن سب لوگوں کا ذکر ہے جو غضب الٰہی کے مستوجب ہوئے جیسے بت پرست، مشرک، قوم عاد و قوم ثمود وغیرہ اور ضالین میں سب گمراہ لوگ آ گئے خواہ کافر ہوں خواہ عاصی۔ مگر تفسیر میں وارد ہوا کہ مغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں اور ضالین سے مراد نصاریٰ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفسیرِ قرآن کی ابتدا

علامہ سیوطی نے اتقان جلد دوم نوع طبقات المفسرین میں لکھا ہے کہ صحابہ میں سے دس بزرگ تفسیر میں مشہور ہیں اور ان میں سے سات سے بکثرت روایت ہوئی ہے۔ وہ دس یہ ہیں خلفاء اربعہ۔ ابن مسعود۔ عبداللہ بن عباس، ابی بن کعب۔ زید بن ثابت۔ ابو موسیٰ اشعری اور عبداللہ بن الزبیر۔ ان میں خلفاء ثلاثہ سے روایت بہت ہی کم ہے۔

تابعین میں بڑے مفسر یہ ہیں :- مجاہد۔ عطا ابن ابی رباح۔ عکرمہ۔ سعید ابن جبیر۔ زید بن اسلم اور مالک بن انس۔

عکرمہ کا قول ہے کہ میں ہر بات جو قرآن کے بارہ میں بتاتا ہوں وہ ابن عباس سے حاصل کی ہے۔

علاوہ ان کے عطاء بن ابی سلمہ۔ محمد بن کعب القرظی۔ ابو العالیہ۔ ضحاک عطیۃ العونی۔ قتادہ۔ زید بن اسلم۔ مرۃ الھمدانی اور ابو مالک وہ مفسرین ہیں جو تابعین میں ہوئے، ان کے بعد کی جماعت میں ربیع بن انس۔ عبدالرحمن بن زید ہیں۔

یہ دو طبقے مفسرین کے ایسے ہیں کہ ان کے اکثر اقوال صحابہ سے لئے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد ایک طبقہ مفسرین ہے جنھوں نے صحابہ اور تابعین کے اقوال کو جمع کیا۔ پھر بہت لوگوں نے تفسیریں لکھیں جنھوں نے اسانید کو کم کیا۔ اور اقوال

جس کے کئی کئی معانی ہو سکیں۔ اور یہ معین نہ ہو سکے کہ قائل کی مراد کیا ہے۔ مبہم کی ضد جامع و مانع ہے جسکی مراد قطعی یقین کے ساتھ معین ہو سکے۔

چنانچہ علامہ سیوطی اتقان جلد ۲ نوع ستر میں مبہمات قرآن سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مبہمات قرآن پر مجھ سے پہلے سہیلی نے پھر ابن عساکر نے پھر قاضی بدرالدین نے مستقل کتاب لکھی۔ اور قرآن مجید میں مبہم بیانات سات وجہ سے پیدا ہوئے۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ نہ صرف سیوطی کو بلکہ دیگر مفسرین کو بھی قرآن مجید کے بیان کا مبہم ہونا مسلم ہے اور وہ یہ بھی بتلانے کو تیار ہیں کہ کس کس وجہ سے بیان قرآن مبہم ہو گیا۔ پس مفسرین کے نزدیک قرآن مجید میں دو عیب ہیں۔

۱۔ وہ ناقص الدلالت ہے۔

۲۔ وہ مبہم ہے۔

صرف اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ قرآن مجید کو نامربوط کلام بھی بتایا۔ یعنی آیات میں باہم ربط نہیں ہے۔

ایک مسلسل تقریر یا تحریر میں جملوں کا مربوط ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا ہو کہ ایک جملہ آسمان کی بات کہے اور اس کے بعد کا جملہ ریسمان کی تو سامع کے لئے انتشار پیدا ہو گا اور کلام عسیر الفہم ہو جائے گا۔ اس لئے نامربوط کلام معیوب ہے باوجود اس کے آیات قرآن کو نامربوط قرار دیا۔

لیکن انھوں نے اس پر اکتفا نہیں کی یہ بھی کہہ دیا کہ قرآن مجید نامربوط کلام ہے آیات میں باہم ربط نہیں ہے۔ اور اسکی ایک نامعقول توجیہ بھی کر دی۔ وہ یہ کہ لوگ جو مسئلہ رسول سے پوچھتے تھے اس کا جواب آیت میں آتا تھا اور چونکہ سوالات متفرق تھے ان میں کوئی ربط نہیں تھا لہذا آیات جو ان کا جواب تھیں ان میں بھی کوئی ربط نہیں تو قرآن مجید کی تیسری صفت یہ ہوئی کہ وہ نامربوط کلام ہے۔

ہیں۔ قرآن مجید میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے ظاہر ہو کہ صرف یہود و نصاریٰ ہی مراد ہیں۔

۲۔ یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ۔ قیامت کے ذکر میں فرمایا کہ اس دن بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ۔ یعنی نجات پانے والے خوش وخرّم ہوں گے اور روسپید۔ اور فی النار ہونے والے یعنی یوم حشر سے سیاہ رو ہوں گے۔ سب ناجیوں کا ذکر ہے اور کل ناریوں کا حال بیان ہوا ہے۔ لیکن تفسیر کی حدیث میں وارد ہے کہ تسود وجوہ میں وجوہ سے مراد خوارج ہیں۔

۳۔ فاما الذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ۔ یعنی جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے تو وہ پیچھے لگے ہیں اس کے جو اس (قرآن) میں تشابہ ہے (یعنی حروف مقطعات کے)

آیتہ کی مراد یہ ہے کہ جن کے دلوں میں ضلالت بیٹھ گئی ہے وہ حروف مقطعات کی تعبیر کے درپے ہوتے ہیں کیونکہ عقلاً ان کی کوئی مراد معین نہیں ہو سکتی لیکن تفسیر کی حدیث میں وارد ہے کہ اس آیت میں خوارج مراد ہیں۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۹۲)

اس طرح کی احادیث اور تفسیروں سے ظاہر ہوا کہ قرآن کہتا کچھ ہے اور مراد کچھ اور ہوتی ہے۔ یعنی اسکی عبارت ناقص الدلالتہ ہے۔

قرآن مجید کا مبہم قرار پانا

تابعین اور تبع تابعین کی تفاسیر میں، حدیث نبوی سے یا اقوال صحابہ سے سند پیش کی گئی ہے ان میں سے جن روایات کے راوی ثقہ تھے ان کو بالکل صحیح تسلیم کیا گیا۔ لیکن ان صحیح تفاسیر میں بھی باہم اختلاف پایا گیا۔ ایک ایک آیت کے چار چار اور پانچ پانچ مختلف معانی ان معتبر تفاسیر میں پائے گئے۔ اور ان سب کو صحیح ماننا پڑا۔ کیونکہ راوی ثقہ ہیں۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ آیات قرآن خود ایسی ہیں جن کے متعدد معانی ہو سکتے ہیں، یعنی آیات قرآن مبہم ہیں۔ مبہم وہ کلام ہوتا ہے

موٹی سی بات ہے کہ جو کتاب ہدایت ناس کیلئے آئے وہ مبہم کیسے ہو سکتی ہے اور جو کتاب احسن الحدیث یعنی بہترین کلام ہونے کا دعویٰ کرے اس میں ایسے عیوب کیسے ہو سکتے ہیں۔ اب اگر ان لغو بات کو رد کر کے اور قرآن مجید کو علیم حکیم کا کلام سمجھ کر اس کی تعبیر سیدھے سیدھے کی جائے۔ یعنی جس طرح ہر کلام کی تعبیر کی جاتی ہے تو قرآن مجید کا حسن بیان اور اس کی معنویت بدرجۂ اتم ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے اس تفسیر میں عیاں کر دکھایا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ متعدد جہات سے اس کا اعجاز بیان اس طرح واضح کر دیا ہے کہ منکر اسلام کو بھی مجال انکار نہیں۔

اس تفسیر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سابق مفسرین کے مذکورہ بالا مفروضات قطعاً باطل ہیں۔ قرآن مجید نہ ناقص الدلالت ہے نہ مبہم ہے بلکہ وہ جامع و مانع ہے۔

اول اس لئے کہ جو کلام ہدایت ناس کے لئے آئے (ھدی للناس) اس کا جامع و مانع ہونا ضروری ہے مبہم کلام سے بجائے ہدایت کے ضلالت پیدا ہونا ضرور ہے۔

دوسرے اس لئے کہ خود قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ وہ جامع و مانع ہے اور اس جہت سے بھی وہ اعجاز ہے کیونکہ قرآن مجید کا موضوع الہیات اور قوانین ہیں اور الہیات اور قوانین پر جو کتابیں ہیں ان میں مفہوم معین کرنے کے لئے اصطلاحات قائم کی گئی ہیں اور ان کی تعریف کی گئی ہے اور پھر بھی ابہام باقی رہ گیا ہے۔ اور قرآن مجید بغیر صرف اصطلاحات کے جامع و مانع ہے اس لئے معجزہ ہے۔ اور چونکہ قرآن مجید جامع و مانع ہے پس اگر صحیح طریقے سے اس کی تعبیر کی جائے تو ہم اس کی حقیقی مراد تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لئے اس کی تفسیر کے لئے نہ حدیث ضروری ہے اور نہ کوئی صحیح حدیث تفسیر پر موجود ہے جیسا کہ امام احمد حنبل نے جو آئمہ حدیث سے بھی ہیں صاف صاف کہدیا کہ تفسیر اور غزوات پر میں کوئی حدیث نہیں پاتا۔

چنانچہ اتقان جلد ۲ نوع ۶۲ میں فرماتے ہیں کہ شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے کہا ہے کہ قرآن بیس سے کئی سال اوپر اترتا رہا اور ان احکام پر مشتمل ہے جو مختلف اسباب کی بنا پر مشروع ہوئے۔ اور جو اس طرح نازل ہو اسکو ایک جز کو دوسرے سے ربط نہیں ہو سکتا۔

پس قرآن مجید میں تین عیب فرض کئے گئے۔ (۱) ناقص الدلالت (۲) مبہم (۳) نامراوط۔

ظاہر ہے کہ ایسا کلام بدترین ہے اور اسکی تعبیر و تفسیر بھی درست نہیں ہو سکتی۔

ان باطل مفروضات کی بنا پر قرآن مجید کی جو تفسیریں کی گئیں ان میں مطالب قرآن کو بالکل مسخ کر دیا بلکہ اس کے صحیح مطالب کا عکس و خلاف بیان کیا گیا اسکی بلاغت سے تو انکار ہی کر دیا کیونکہ بلیغ کلام کا جامع و مانع ہونا ضرور ہے، اور قرآن کو مبہم قرار دیا۔

ان تفسیروں نے اسکی معنوی خوبیاں اور معارف علمیہ کو پوشیدہ کر دیا۔ اسکی عبارات قلیل معانی کثیرہ پر دلالت کرتی ہیں وہ سب غائب ہو گئیں۔ اسکی لفظی مناسبتوں پر پردہ پڑ گیا۔ اور جب محاسن کلام ہی باقی نہ رہے تو وہ حسن بیان کا معجزہ کیونکر ہو سکتا تھا۔

تقلید اس طرح عالم اسلام پر چھائی رہی کہ ہر فرقہ قرآن مجید میں ان عیوب کا موجود ہونا تسلیم کرتا ہے۔ سنی اور شیعہ سب۔

شیعہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ ان کے نزدیک قرآن مجید کے مطالب صرف معصوم سمجھتے تھے۔ لہذا بغیر حدیث امام وہی تفسیر نہیں ہو سکتی اور اگر قرآن کو ہر شخص سمجھ سکے تو پھر بارہ اماموں کی کیا ضرورت رہی۔ حالانکہ اس کے خلاف تمام علماء اسلام مانتے ہیں کہ قرآن مجید نہایت فصیح و بلیغ ہے اور بلیغ ہے تو جامع و مانع ہے۔ اس لئے مبہم نہیں اور نہ ناقص الدلالت ہے۔ اور

ترتیب زمانی کے لحاظ سے مرتب حاصل ہوگا۔ یعنی حکایت میں پہلے کا واقعہ پہلے اس کے بعد کا اس کے بعد۔ اسی طرح ہر نبی کا حال مرتب حاصل ہوگا۔

یہی حال دیگر موضوعات کا ہے جیسے جن۔ سماء۔ ملائکہ۔ وحی۔ صلواۃ۔ میراث۔ نکاح وغیرہ وغیرہ۔

مفسرین ان تمام امور سے غافل رہے جسکی وجہ اول تو تفسیر کے غلط قواعد کا اختیار کرنا ہوا۔ دوسرے دین حق اور قرآن مجید کے متعلق باطل مزعومات ہوئے، پھر اسلاف کی تقلید نے ان کے آگے اور پیچھے پردے ڈال دیے۔ دین کو راز کی باتوں کا مجموعہ قرار دیا۔ عقل کو پس پشت ڈال کر صرف نقل پر اعتماد کیا۔ غیر معقول باتیں سامنے آئیں ان کو عقل سے بالاتر قرار دیکر رازہائے الوہیت قرار دیا اور اس طرح دل کو تسلی دے لی۔

غرض کتاب

اس کتاب کی اصل غرض یہ ہے کہ منکرین پر اسلام کی حجت تمام کی جائے اور بالخصوص اس کا مقصد یہ ہے کہ بنی اسمٰعیل کی بھیڑوں کو راہ پر لایا جائے یعنی وہ تعلیم یافتہ مسلمان جو علوم مغربی سے متاثر ہوکر عقائد اسلام کو ترک کر بیٹھے ہیں، دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوں۔ اس ترک کا خاص سبب یہ ہے کہ ان پر اسلام مسخ کرکے پیش کیا گیا۔ اسمیں افسانہائے باطل اور عقائد فاسد اسطرح داخل کئے کہ وہ اسلام کا جزو نظر آئے اور چونکہ ان کی لغویت اہل عقل پر عیاں ہے وہ دین حق کے ترک کا سبب ہوئے اور ان لغو باتوں کا ماخذ قرآن مجید کی آیات کو ان کی غلط تعبیر کرکے دکھایا گیا اس لئے اس کلام حق پر بھی آنچ آئی۔ اس طرح قرآن مجید کی صحیح تفسیر بھی ضروری ہوگئی۔

اس کتاب کے مخاطب وہی تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو علوم مغربی سے متاثر ہوکر عقل پر

دوسری جہت اعجاز جس کا دعویٰ قرآن مجید میں ہے وہ یہ ہے کہ اسکی عبارات قلیل اس قدر معانی کثیر پر دلالت کرتی ہیں کہ اسکی مثل پر کوئی اور قادر نہیں ہوسکتا۔ یعنی آیت کی مراد سے التزاماً کثیر مطالب پر دلالت آتی ہے۔

تیسری جہت احسن الحدیث سے ظاہر ہے۔ یعنی محاسن کلام اس کثرت سے اس کلام میں جمع ہیں کہ ان کی مثل ممکن نہیں ہے یعنی جب خداوند عالم نے قرآن مجید کو بہترین کلام فرمایا تو مراد یہ ہوئی کہ اسکی برابر مستحسن کلام نہیں ہوسکتا۔ اس لئے وہ معجزہ ہوا۔

چوتھی جہت اسکی صنعت تالیف ہے۔

۱۔ اسکی تالیف میں ایسی صنعت رکھی ہے جس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ترتیب نزول میں سابق سورہ کون سا ہے اور لاحق کون سا۔

۲۔ تالیف میں ایسی صنعت ہے جس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید کامل ہے یا اس کا کوئی جز ضائع ہوگیا ہے۔

۳۔ قرآن مجید میں آیات کا مربوط ہونا بیان ہوا ہے اور فرمایا ہے کہ جو لوگ آیات میں ربط نہیں دیتے ان سے حشر میں مواخذہ ہوگا۔ لہذا قرآن مجید نامربوط کلام نہیں ہے۔

۴۔ قرآن مجید میں کتاب کا مقدمہ بیان ہوا ہے۔ مقدمۃ الکتاب پر ۲۵۴ آیات ہیں اور وہ عموماً سوروں کی ابتدا میں واقع ہوئی ہیں۔ مقدمہ میں ۹۷ امور کا ذکر ہے۔

۵۔ قرآن مجید میں اسکی تعبیر اور تفسیر کے قواعد بیان ہوئے ہیں۔

۶۔ قرآن مجید میں اگرچہ بہت سے موضوعات پر بیانات مختلف سوروں میں واقع ہیں لیکن اگر ان بیانات کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے ایک جا جمع کرلیا جائے تو ایک مسلسل اور مرتب بیان ہر موضوع پر حاصل ہوجاتا ہے، مثلاً حضرت موسیٰ کا حال ۲۴ سوروں میں ہے۔ اگر ترتیب نزولی کے اعتبار سے ہر سورہ سے ان آیات کو لیکر جمع کرتے جاؤ تو حضرت موسیٰ کا قصہ یعنی کار رسالت

تعارف

تفسیر قرآن سے پہلے تفسیر کا مفہوم اور اس کی غرض واضح کرنا ضروری ہے، اسی کے ساتھ قرآن کی ماہیت کہ وہ کیا ہے، وہ خدا کا کلام ہے، اس میں اس کے احکام ہیں جن کی تعمیل بندوں پر واجب ہے۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بندوں پر احکام الٰہی کی تعمیل کیوں واجب کی گئی ہے؟ ان کی تعمیل پر ثواب اور خلاف ورزی پر عذاب کیوں مقرر فرمایا ہے یعنی انسان پر دین و مذہب کی پابندی کیوں واجب ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ جب خدا کے نہ جسم ہے نہ ذہن نہ آواز تو کلام خدا کے کیا معنی ہیں؟

اس تفسیر کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان سوالوں کا جواب مدلل اور معقول دیا گیا ہے اور انھیں جوابات کو قرآن مجید سے بھی پیش کیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تفسیر کے اصول و قواعد سے بحث کی گئی ہے۔ صحیح ضوابط کی تحقیق کی گئی ہے۔ پھر انھیں ضوابط و قواعد کا بیان قرآن مجید میں دکھایا ہے۔ اور کل تفسیر انھیں قواعد پر مبنی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآن مجید کا جامع و مانع ہونا ثابت کیا ہے۔ ہر آیت کی ایک معین مراد ہے جو یقین کے ساتھ معلوم ہوتی ہے ایسا نہیں ہے کہ آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں اور وہ معنی بھی۔

معتبر مفسرین نے ہر آیت کے متعدد معنی تجویز کئے اور علماء نے یہ جائز قرار دیا کہ ان میں سے جو معنی چاہو اختیار کر لو۔ اس طرح قرآن مجید کو مبہم اور ناقص الدلالت قرار دیا۔ اس طرح قرآن مجید پر ظلم کیا اور اس سے بڑا ظلم

اعتماد کرتے ہیں، اور حاکم عقلی کو قول فیصل مانتے ہیں۔
"تقلیدی مذہب والے اس کے مخاطب نہیں، ان کے نزدیک
وہی درست ہے جو ان کے اسلاف کہتے آئے ہیں، خواہ وہ کیسی
ہی نامعقول بات ہو۔ ایسے لوگوں کو اس کتاب سے کوئی فائدہ نہ ہوگا

اتخذ ذا ھذا القرآن مھجورا   قوم نے اس قرآن کو متروک قرار دیا

نوٹ :۔ یہ آیت اوپر قیامت کے ذکر سے متصل ہے اس لئے احوال حشر کا بیان ہے اس آیت سے ثابت ہے کہ حشر میں نبی کریم عموماً امت کی یہ شکایت کریں گے کہ اس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا اور شکایت کے معنی سزا کی طلبگاری۔

تفسیر کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ بحکم القرآن یفسر بعضہ بعضا (قرآن کا ایک جزو دوسرے کی توضیح کرتا ہے) ہم نے قرآن کی تفسیر خود قرآن کی تائید سے کی ہے

پانچویں خصوصیت :۔ قرآن مجید میں بکثرت صحائف قدیم کی ہے کے حوالے وارد ہیں۔ پس توریت و زبور و انجیل وغیرہ کی محولہ ایات نقل کرکے مطالب قرآن کی توضیح کی گئی ہے۔

چھٹی خصوصیت :۔ قرآن مجید کی آیات کا مربوط و مسلسل ہونا ثابت کیا ہے اور اس اعتقاد کا باطل ہونا عیاں کیا ہے کہ آیات قرآن ایک دوسرے سے بیربط ہیں۔ اور معنی کے اعتبار سے باہم کوئی علاقہ نہیں رکھتیں۔

ساتویں خصوصیت :۔ ہر مضمون یا موضوع کی بحث یکجا کر دی گئی ہے التزام یہ ہے کہ جس سورہ سے کسی مسلہ کی بحث کا آغاز ہے وہیں کل قرآن کی متعلقہ آیات کو جمع کرکے اس کی پوری بحث کر دی گئی ہے مثلاً اول نازل شدہ سورہ الفاتحہ ہے اس میں توحید و عدل رسالت و معاد و وجوب طاعت کی بحث ہے پس سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ان سب کی جامع بحث وارد ہے چنانچہ توحید یا ایمان باللہ پر کل ایات قرآن کو جمع کرکے بحث مرتب کر دی ہے وعلی ہذا عدل و معاد وغیرہ پر۔

علاوہ بریں سوروں کی تفسیر ترتیب نزول کے لحاظ سے مرتب کی ہے اس طرح واضح کیا ہے کہ قرآن مجید میں ہر موضوع (مثلاً صلوٰۃ) پر کس طرح احکام کا اضافہ ہوتا رہا۔

آٹھویں خصوصیت :۔ اس تفسیر میں قرآن مجید کا اعجاز بیان متعدد وجوہ اور بیشمار مثالوں سے عیاں کر دیا گیا ہے۔

نویں خصوصیت :۔ معارف قرآن کی تائید میں فلسفہ جدید اور سائنس کے

اپنے نفوس پر کیا قرآن مجید حقیقتاً حسن بیان کا معجزہ ہے۔ فصیح اور بلیغ ہے اور بلیغ کلام کا جامع و مانع ہونا ضروری ہے لیکن انھوں اس کو مبہم اور ناقص الدلالت قرار دے کر بدترین کلام ثابت کیا یہ قرآن حکیم پر ظلم ہے۔ اور اپنے اوپر یہ ظلم کیا کہ خود کو قرآن مجید کی ہدایت سے محروم کرلیا۔ وہ اس طرح کہ جب آیات کے پانچ پانچ اور دس دس معنی تجویز کئے تو کوئی معنی یقینی نہ ہوئے لہذا کوئی مطلب قرآن سے ثابت نہیں ہوسکتا کیوں کہ دوسرے معنی کا احتمال قائم ہے اس طرح ان کے لئے قرآن مجید حجت نہ رہا اب ان کی یہ روش ہوگئی کہ قرآن مجید سے کوئی مطلب ثابت کرو تو وہ ہرگز اس پر اتفاق نہیں کرتے سمجھتے ہیں قرآن سے کوئی مطلب ثابت نہیں۔ کیوں کہ اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں اور وہ معنی بھی۔ اس حیرانی کے عالم میں اخذ مسائل کے لئے احادیث کی طرف رجوع کی لیکن حدیث کی صحت کا معیار قرآن مجید سے موافقت ہے۔ حدیث ہے کہ "عرض کرو اخبار کو قرآن پر اگر موافق قرآن پاؤ قبول کرو ورنہ دیوار سے مار دو" ان کے نزدیک قرآن مجید کے کوئی معین معنی نہیں ہیں۔ لہذا حدیث کو قرآن مجید سے نہیں جانچ سکے۔ نتیجہ یہ کہ بے شمار وضعی حدیثیں ان کے نزدیک معتبر قرار پائیں۔

حکم شارع کے خلاف تفسیر قرآن الٹی حدیث سے کرنے لگے اس طرح وضعی احادیث کے مطالب قرآن کی آیات میں ٹھونسے گئے اب حدیث کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو قرآن سے کیا تھا یعنی احادیث کے متعدد اور مختلف معنی نکالے۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ہمارے علماء جس بات پر اتفاق کرتے ہیں وہی حق ہے یہ سبب ہوا کہ مسلمانوں میں قرآن مجید بالفعل ایک متروک و مہجور کتاب قرار پاگئی۔ امت محمدی کا قرآن مجید سے جدا ہو جانا ایک نہایت اہم واقعہ ہے حتی کہ اس صورت حال کی خبر قرآن مجید نے پہلے ہی سے دی ہے وہ یہ ہے کہ حشر میں نبی کریمؐ خداوند عالم سے امت کی شکایت کریں گے کہ خداوند میری امت نے اس قرآن کو متروک و مہجور قرار دیا۔

فرقان (۳)

وقال الرسول یارب ان قومی — اور یہ رسول کہیگا کہ اے میرے رب میری

عالم کو خلق کیا اور اس کو ذوی العقول کا مسکن اور سامان تربیت بنایا۔ انسان کو اس لئے بنایا کہ وہ تکمیل نفس کرے یعنی علمی اور اخلاقی ترقی سے بہتر درجہ حیات کی اہلیت پیدا کرے اور اس کا مستحق بنے۔ اس بہتر درجہ حیات کی عطا غرض آفرینش ہے یعنی خدا نے ہم کو کیوں پیدا کیا؟ اس لئے کہ ہم اپنی ترقی سے بہتر درجہ حیات کو پہنچیں۔
اگر انسان اپنے کردار سے تنزل اختیار کرے۔ جہالت اور بدکاری سے اسفل السافلین میں جا پڑے تو اس کے لئے اس اہلیت کے مطابق ایک ذلیل اور دردناک حیات ہے۔
تحقیق سے یہی مذہب ثابت ہے جیسا کہ ابھی ظاہر ہوگا۔ یہ سبب ہے کہ انسان پر تحقیق حق واجب ہے اور دین حق کا اختیار ضروری ہے۔ اس تحقیق میں دونوں پہلوؤں پر نظر کرنا ہے۔ مخالفین مذہب یہ کہتے ہیں کہ مذہب اوہام پرستی ہے اور مانع ترقی ہے۔
اعتراض نمبر ۱۔ زمین پر بہت قسم کے حیوانات ہیں ان میں سے ایک انسان بھی ہے کھانا پینا آرام سے رہنا اولاد پیدا کرنا حیوانات کا فطری کام ہے۔ انسان کو بھی ان سے چارہ نہیں۔ یہی ان کا مقصد حیات ہے ہم کو اکتساب معاش اور دنیوی مشاغل سے فرصت نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ کیوں وہ دور از کار عقائد و اعمال اختیار کرے۔
جواب ۱۔ انسان اور دیگر حیوانات میں فرق ہے انسان عاقل ہے اور حیوان عقل سے خالی۔ اس لئے جانوروں کے احوال پر انسان کے احوال کا قیاس کرنا درست نہیں۔ اور وہ فرق انسان کی تمدنی ترقی۔ علمی اکتساب اور سائنس کے انکشافات سے عیاں ہے۔ انسان کے لئے بعض کام اچھے ہیں اور بعض برے جانوروں کے لئے ایسا نہیں۔
عقل حق و باطل میں امتیاز کرتی ہے اور غور و فکر سے نظری حقائق کا ادراک کرتی ہے۔ پس بحکم عقل جو دین حق ثابت ہو اس کا اختیار کرنا ضروری ہے جیسے دو اور دو کے مجموعہ کو چار کہنا ضروری ہے اور کل کو جز سے بڑا کہنا ضروری ہے۔
اعتراض ۲۔ مذاہب عالم پر نظر کیجئے۔ ایک مذہب کے عقائد دوسرے کے خلاف ہیں اور ہر مذہب کی بنا ایک مجموعہ روایات پر ہے جو متواتر نہیں کہ شبہ ہوں اور مزید

افادات بکثرت پیش کئے ہیں۔

اب ہم ان سوالوں کا اجمالی جواب یہاں پیش کرتے ہیں جن کا اس تفسیر سے مخصوص ہے۔

دین یا مذہب کیا ہے؟

مخالف کہہ سکتا ہے کہ ہم کیوں کسی دین یا مذہب کو مانیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین یا مذہب کا اختیار ناگزیر ہے۔ ہر انسان کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے لہذا عاقل پر واجب ہے کہ امر حق یعنی صحیح مذہب اختیار کرے۔ وہمی اور قیاسی باتوں کو ترک کر کے تحقیق اور حق کی راہ پر چلے۔ مذہب ہے کیا؟ اپنے مبدا اور منتہی کا علم یعنی ہمارا اور عالم کا وجود کس طرح ہوا یہ مبدا کی بحث ہوئی، آیا کوئی خالق ہے یا عالم قدیم ہے اور آیا مرنے کے بعد پھر ایک اور حیات ہے یا اس موت پر ہمارا اختتام ہے۔ یہ منتہی کی بحث ہے ان امور کے متعلق ہر عاقل کے ذہن میں ایک رائے ہے۔ یہی مذہب ہے اور اس سے کوئی ذی فہم خالی نہیں۔ یہ مذہب چار نوع پر ہے۔

اوّل :- خالق عالم موجود ہے اور حیات آخرت ہوگی (یہود و نصاریٰ و مسلمان)

دوم :- صانع عالم ہے لیکن حیات آخرت نہ ہوگی (بعض حکماء کا مذہب)

سوم :- خالق عالم کوئی نہیں عالم قدیم ہے لیکن موت کے بعد حیات ہے۔

(جینی اور بدھ مت)

چہارم عالم قدیم ہے اور موت پر انسان کا خاتمہ ہے (دہریین اور مادیین)

دنیا کے تمام مذاہب اور فلسفہ کے سب نظام ان میں سے کسی ایک نوع میں داخل ہیں۔ اس لئے منکر دین و مذہب بھی ایک مذہب رکھتا ہے پس جب مذہب ناگزیر ہے تو بجائے وہمی یا قیاسی مذہب کے تحقیقی اور یقینی مذہب اختیار کرنا واجب ہے، اس بارہ میں تحقیق حق ممکن ہے جیسا کہ ہم ثابت کریں گے۔ یہ تحقیقی مذہب دین حق ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ ہم کو اور عالم کو پیدا کرنے والی ایک ذات ہے جو ہر صفت سے کامل ہے۔ اس ذات کامل نے

ہم کو ادراک حسی حواس خمسہ سے ہوتا ہے یعنی آنکھ ناک کان وغیرہ سے اور ادراک حسی جانوروں کو بھی ہوتا ہے

ادراک حسی فرد کا ہوتا ہے ایک وقت میں ایک شے مشاہدہ میں آتی ہے۔ اس لئے حواس خمسہ ہم کو چند افراد کا احوال بتاتے ہیں۔ ان سے عمر، بکر، زید کا حال معلوم ہوتا ہے یا مثلاً ایک خاص مثلث کا حال معلوم ہوتا ہے۔ وہ بات جو ہر انسان یا ہر مثلث شے کے لئے درست ہو حواس سے معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ کسی کو ہر انسان اور ہر مثلث کا مشاہدہ نہیں ہوا ورنہ ہو سکتا ہے اگر ایک ہندی نے بہت سے طوطے دیکھے اور سب ہرے تھے تو اس کا یہ نتیجہ نکالنا کہ سب طوطے ہرے ہوتے ہیں بداہۃً باطل ہے لیکن ہم کو علم ویقین ہے کہ ہر انسان فانی ہے۔ اور ہر مثلث شے کے تینوں زاوے ملکر دو قائموں کی برابر ہوتے ہیں۔ پس انسان کو تصور کلی اور تصدیقات کلیہ حاصل ہیں۔ لہٰذا ان میں ادراک کلیات کی قوت ہے۔ اسی قوت کا نام عقل ہے۔ (اور اصطلاح میں مناقشہ نہیں) پس عقل کی تعریف بھی حاصل ہوئی کہ یہ وہ قوت ہے جو ادراک کلیات کرتی ہے۔ اور اس کا بیاد ادراک ماہیت موضوع ومحمول پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر انسان فانی ہے اس لئے کہ جسم اور جسم نامی ہونے سے اس میں فنا کی قابلیت موجود ہے اسی طرح ہر کل اپنے جزء سے بڑا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جزء مع دیگر جزء کے کل ہوتا ہے۔

دیگر حیوانات میں عقل نہ ہونا

ہماری گفتگو کے ہر جملہ میں ایک تصور کلی ضرور ہوتا ہے۔ جیسے زید بازار گیا۔ عمر کھانا کھا رہا ہے ہمارے پیر میں چوٹ لگ گئی ہے، ان میں بازار کھانا۔ پیر۔ چوٹ کلی تصورات ہیں لیکن تصور کلی کا ادراک کرنا عقل کا کام ہے۔ پس جس کو عقل حاصل ہے وہی کلام کر سکتا ہے۔ اور جو کلام کر سکتا ہے وہ عاقل ہے۔ جانور کلام پر قادر نہیں ہے اس لئے وہ عقل سے عاری ہے۔ دوسرا ثبوت۔ عاقل تدبر کرتا ہے یعنی غور وفکر سے حصول مقصود کے وسائل نکالتا ہے جس کا نتیجہ ترقی علم وتمدن ہے۔ انسانی جماعتوں میں یہ ترقی عیاں ہے۔ لیکن بہت سے جانور جو اپنی جماعت میں رہتے ہیں جیسے بندر

بران اکثر خرافات ہیں۔ ان کی وضع وہی ہے جو دیوا دپری کے افسانوں کی ہے
ایسے امور کو یقینی سمجھنا انسان عاقل کو اسکے مرتبے سے گراتا ہے۔ لہذا انمیں سے کسی مذہب
کا اختیار کرنا سفاہت ہے۔

جواب:۔ بیشک وہ مذاہب جن کی بنا صرف ان کی روایات پر ہے باطل
ہیں اور دین حق کی بنا قطعاً یقینی امور پر ہے جو صحیح دلائل سے ثابت ہیں۔ اس لئے دین حق
کا اختیار کرنا عقل کا تقاضا ہے۔ دین حق ایک ہی ہے۔ اور وہی زیر بحث ہے۔

اعتراض ۳۱:۔ انسان کی فطرت میں خوف ہے اس لئے اس نے ارضی و سماوی
خطرات سے بچنے کے لئے فرضی عقاید اور اعمال اختیار کئے۔ مذہب کی ابتدا حیوان پرستی
اور قوائے فطریہ کی پرستش سے ہوئی بعد کو علم کی ترقی کے ساتھ اصلاح ہوتی گئی مگر وہ
سب وہمی باتیں ہیں جن کو لوگ اپنے آبا و اجداد کی تقلید میں سچ سمجھتے رہے۔

جواب:۔ واقعی خطرات کو خیالی مفروضات سے نہ کوئی رفع کر سکتا ہے اور نہ کسی
نے ایسا کیا۔ مثلاً جنگل میں درندوں سے خطرہ ہے جنگل سے گزرنے والا شخص یہ خیال
قایم کر کے کہ میرے پاس بندوق ہے جس کا وجود صرف خیال میں ہو۔ کوئی تسلی نہیں پا
سکتا اور نہ یہ خیالی مفروضہ کہ فرشتے میری حفاظت کر رہے ہیں اس کے خوف کو رفع
کر سکتا ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ حوادث فطرت (بارش، ہوا وغیرہ) سے جب اس
کو فائدہ اور ضرر پہونچا تو اس نے قوائے فطریہ کو عاقل ہستیاں قرار دیا۔ یا ان کے
پس پشت عاقل ہستیوں کو کارفرما سمجھا اب ان ہستیوں سے امید و بیم قایم ہوا۔
پس مذہبی خیالات پہلے پیدا ہوئے اور پھر ان سے خوف و رجا پیدا ہوئے لہذا
یہ غلط ہو گیا کہ خوف و رجا سے مذہبی خیالات پیدا ہوئے۔

عقل کی تعریف اور اسکا انسان میں موجود رہنا

اس محل پر منکر قرار کے دو راستے اختیار
کرتا ہے۔ اول عقل کے وجود سے انکار، دوسرے حیوانات کے شعور کو بھی عقل قرار دینا
اس کا رد یہ ہے۔

ہیں وہ فرق ہے جو عقل اور حس میں امتیاز کرتا ہے کلی کی نمایاں مثال مکان یا زمان کا مفہوم ہے ادراک حسی اور وجدانِ الم و راحت ہر مدرک میں پائے جاتے ہیں ۔ یہ سب جزئیات عارضی ہوتے ہیں ادراک عقلی میں ہم ہمیشہ کلیہ اور ضروری کلیہ پاتے ہیں اس لئے فرد اور جزی کے حس میں کلیات کا ادراک نہیں ہو سکتا DR. JAMES WARD: THE REALM OF ENDS

عقل کوئی وہمی یا خیالی شے نہیں بلکہ ایک حقیقی قوت ہے جس کا مفہوم اس کے افعال سے قطع کے ساتھ معین ہے ۔ DR. WARD: IBID اب ہم معترض کے تیسرے اعتراض کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ ثابت کر آئے ہیں کہ خوف و رجا مذہبی خیالات کا سبب نہیں ہیں بلکہ پہلے مذہبی خیالات پیدا ہوئے اس کے بعد غائب ہستیوں سے خوف و رجا قائم ہوا اس لئے مذہبی خیالات کی علت تحقیق کرانا باقی رہا۔

اعمال فطرت کے مشاہدہ سے انسان اس نتیجہ پر پہونچے کہ ان اعمال فطرت کے پس پشت عاقل ہستیاں کارفرما ہیں اس نتیجہ پر انسان وجدان سے اور اقتضائے عقل سے پہونچتا ہے اور حقیقت کی طرف ایک قدم آگے بڑھاتا ہے ۔ اس لئے کہ اعمال فطرت سے خاص اغراض حاصل ہو رہے ہیں جیسے بارش ہوا و حرارت آفتاب سے پھل اور غلہ کا پیدا ہونا ۔ اس غرض کا حصول ظاہر کرتا ہے کہ ان کے پس پشت عاقل ہستی کارفرما ہے حکمت اور فلسفہ اس نتیجہ سے متفق ہیں

"انسان کو عالم کا علم وہی ہے جس صورت سے عالم اس پر نمایاں ہے اور وہ اس پر عمل اسی حد تک کرتا ہے جس حد تک وہ اس کی سمجھ میں آتا ہے ۔ اور جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ معقول ہے یعنی سمجھا جا سکتا ہے ۔ تو وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ عالم ایک اجنبی اور غیر قسم کی ہستی نہیں بلکہ اس کی بنائے وجود اور حقیقت یا تو کوئی نفس عاقل ہے ۔ یا نفوس عاقل کی ایک جماعت"

بن مانس اور باوجودیکہ وہ انسان سے لاکھوں سال پہلے پیدا ہوئے لیکن ان میں علم و تمدن کی ترقی مفقود ہے اس لئے ظاہر ہے کہ جانوروں میں عقل نہیں۔

تیسرا ثبوت ۔تحقیق سائنس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جہاں جس قوت کے آثار پائے جاتے ہیں وہاں اس کا وجود ثابت ہے اور جس قوت کے آثار وہاں نہیں پائے جاتے وہاں اس کا نہ ہونا ثابت ہے۔

جانوروں کی روش اور عمل کی توجیہہ ان کے ادراک حسی اور رجحان فطری (INSTINCT) سے ہو جاتی ہے اور ان کا کوئی عمل ایسا نہیں جس سے ان دو قوتوں کے علاوہ کسی اور قوت کا موجود ہونا ضروری ہو۔ اس لئے جانوروں میں عقل کا نہ ہونا ثابت ہے بہت سے مسلمانوں کا بھی یہ خیال ہے کہ جانوروں میں عقل ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں اس کے خلاف تصریح ہے اور وہ یہ ہے۔

قرآن ۔ ۵ ۔

ارءیت من اتخذ الٰہہ ھواہ افانت تکون علیہ وکیلا ام تحسب ان اکثرھم یسمعون او یعقلون ۔ ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا

کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود قرار دیا ہے (یعنی اس کا اتباع کرتا ہے۔ تو ایسے شخص کا ضامن ہوگا؟ کیا تو سمجھتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے یا عقل سے کام لیتے ہیں وہ صرف چوپاؤں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اس آیت میں فرمایا ہے کہ جو انسان صرف خواہش و میلان طبع پر عمل کرے اور عقل سے کام نہ لیں وہ چوپاؤں کی مانند ہے کہ وہ صرف خواہش اور میلان طبع پر کام کرتے ہیں اور عقل ان میں ہے ہی نہیں کہ اس سے کام لیں۔ انسان ان سے گمراہ تر ہے کہ عقل رکھتا ہے اور اس سے کام نہیں لیتا۔

علم النفس میں یہ تصریح ہے کہ جانور عقل سے خالی ہیں چنانچہ ڈاکٹر وارڈ جو علم النفس کا سب سے بڑا ماہر ہے کہتا ہے۔ ادراک جزئیات اور احاطہ کلیات

اور مخلوقات کی تربیت و ترقی غرض آفرینش ہے
اور یہ ترقی ہر نوع کی صلاحیت پر موقوف ہے۔
انسان عاقل ہے اور برائی و بھلائی کا مدرک ہے یہ اس کی صلاحیت ہے
اس لئے اس کی تکمیل علمی و اخلاقی ترقی ہے
اور یہی دین حق یا مذہب راست ہے۔
نوٹ: یہ خالق عالم کا موجود ہونا متعدد دلائل قطعیہ سے ثابت ہے جن کا بیان آگے آتا ہے۔

مزید توضیح

انسان مشاہدہ فطرت اور غور و فکر سے برابر علمی ترقی کر رہا ہے۔ سائنس اور دیگر علوم کی ترقی اس کی شاہد ہے۔
سائنس کی تحقیق میں ہم قوائے فطریہ کے محسوس آثار اور افعال سے ان کے وجود تک پہونچتے ہیں، قوائے فطریہ اپنی ذات میں غیر محسوس ہیں مثلاً مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے یہ اثر یا عمل محسوس ہے جس سے قوت مقناطیسی کا وجود ہم پر ثابت ہے اگرچہ قوت مقناطیسی اپنی ذات میں غیر محسوس ہے اور اس کی ماہیت معلوم نہیں۔
یہی حال قوت برق کا ہے اس کے آثار و اعمال ہم پر ظاہر ہیں قوت برق کی نہ ماہیت معلوم ہے اور نہ وہ اپنی ذات میں محسوس ہے۔ اسی طرح مادہ کے اثرات محسوس ہیں یا اس کی ذات غیر محسوس ہے مادہ کو نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے جو کچھ اس میں محسوس ہے وہ اس کے اعراض ہیں جیسے شکل، رنگ، حجم۔ اس کے اثرات یا تاثرات یہی حال نفس انسان یا روح کا ہے نفس ادراک کرتا ہے اور ارادہ کرتا ہے اشیا میں تصرف کرتا ہے اس کے یہ اعمال اپنے اثرات سے ظاہر ہیں ان سے ہم روح کے وجود تک پہونچتے ہیں۔ خود روح محسوس نہیں۔

اس استدلال کی شرح Dr. J WARD. THE RIALM OF ENDS
یہ ہے کہ انسان اپنی اغراض پوری کرنے کو عمل کرتا ہے۔ ضروریات کی جستجو ماحول
میں کرتا ہے دیکھتا ہے کہ نیچر سامان غذا، غلہ پھل دودھ وغیرہ علی الاتصال فراہم
کررہا ہے اس کو پانی کی تلاش ہے نیچر دریاؤں چشموں اور کنوؤں میں برابر پانی پہونچا
رہا ہے۔ اس کو لباس کی حاجت ہے نیچر لگاتار جانوروں کی کھالیں اون ریشم روئی
بہم پہونچا رہا ہے۔ وعلی ہذا دیگر ضروریات پس خاص اغراض کے حصول میں نیچر
اسی طرح کام کررہا ہے جیسے عاقل ومختار اغراض کو ذہن میں لے کر کام کرتے ہیں
اس لئے نیچر یا تو خود عاقل ہے یا کوئی عالم ومختار ہستی نیچر کے پس پشت
کارفرما ہے
سائنس کی ترقی نے اس نتیجہ کی مزید تائید کی ہے عام مشاہدہ ہے کہ
ہر جاندار ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے رفتہ رفتہ ایک اعلیٰ درجہ پر پہونچتا ہے برگد کا
چھوٹا بیج ایک عظیم الشان درخت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ انسان خون بستہ
کی حالت سے ترقی کر کے ایک شجاع وعالم جوان بنتا ہے جس سے صاف ظاہر ہے
غرض آفرینش مخلوقات کی مدارج حیات میں ترقی ہے۔ طبقات ارض کے دقیق
مشاہدہ سے ظاہر ہوا کہ اس دنیا کی ابتدا جمادات سے ہوئی۔ پھر ادنیٰ ترین جانداروں
کا ظہور ہوا۔ پھر ان سے اعلیٰ جاندار پیدا ہوئے۔ اس طرح تدریجی ترقی ہوتی رہی یہاں
تک کہ آخر میں انسان کا ظہور ہوا۔ نسل انسان بھی علم وتمدن کے بہت سے مدارج
سے گزری۔ اس مسلسل ارتقا سے ظاہر ہے کہ نیچر ایک منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے
اور اس منزل تک پہونچنے کے لئے وہ انتخاب طبعی کر رہا ہے تاکہ بہتر افراد قائم رہیں
اور پھر آگے ترقی کریں پس نیچر کے اعمال غرض واحد کی طرف راجع ہیں لیکن غرض
کا وجود صرف ذہن میں ہو سکتا ہے جو فاعل مختار کے علم میں پہلے سے ہوتی
ہے پس نیچر کے پس پشت ایک عالم اور مختار ہستی کارفرما ہے کیونکہ خود نیچر ادراک
وشعور سے عاری ہے حاصل یہ کہ اس عالم کا ایک خالق وحکمراں ہے۔

ہو جاتا ہے۔

۲۔ خداوند عالم حکیم مطلق ہے اس لئے اس سے فعل عبث نہیں ہو سکتا کیوں کہ فعل عبث یعنی بے کار کام سفاہت ہے اور قبیح ہے۔

تیسرا مقدمہ:۔

عالم کو پیدا کرنے کی کوئی غرض ضرور ہے کیوں کہ خدا کا فعل عبث نہیں ہو سکتا اور فاعل مختار کے فعل کی غرض یا تو کوئی نفع ہوتی ہے یا کسی کو ضرر پہونچانا اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔

لیکن کسی غیر مستحق کو ضرر پہونچانا ظلم ہے اور قبیح ہے پس محمود مطلق سے اس کا صدور محال ہے۔

لہذا تخلیق عالم کی غرض کوئی نفع ہے۔

چوتھا مقدمہ:۔

جس نفع کے لئے عالم خلق کیا گیا ہے وہ نفع یا تو خالق کے لئے ہوگا یا مخلوق کے لئے لیکن ذات کامل کو نفع پہونچنا محال ہے اس لئے کہ اگر اس کو نفع پہونچے تو نفع پہونچنے سے پہلے اس کا ناقص ہونا لازم آئے گا اس لئے منحصر ہوا کہ غرض تخلیق مخلوق کا نفع ہے۔

اسی طرح جب ہم تمام شجر میں تدبیر اور حکمت اور نظم و تصرف کے آثار پاتے ہیں ان سے ہم مدبر و ناظم عالم کے وجود تک پہونچتے ہیں۔ اور وہ مثل ہماری روح کے بذات خود غیر محسوس ہے۔ سائنس کے اصول تحقیق اس نتیجہ پر پہونچاتے ہیں۔

خداوند عالم وہ ذات کامل ہے جو بسبب اپنے کمال ذات کے بالذات موجود ہے۔ باقی موجودات میں نقص و احتیاج عیاں ہے۔ وہ سب اپنے وجود میں اس کی طرف محتاج ہیں

ذات کامل کیا ہے وہ ذات جو ہر صفت کمال سے موصوف ہے یا جس میں ہر خیر و خوبی موجود ہے۔

یعنی وہ محمود مطلق ہے وہ خوبیاں جن کو نقص لازم ہے اس کی ذات میں نہیں ہو سکتیں کیوں کہ ذات کامل کا ہر نقص سے پاک ہونا ضروری ہے نقص کمال کی ضد ہے ذات کامل کے موجود ہونے پر دلیل کی مفصل بحث آگے آتی ہے۔

تخلیق عالم کی غرض و غایت

یعنی خدا نے عالم کو کیوں پیدا کیا۔ یہ بحث نہایت اہم ہے اس ہی پر تمام قرآن مجید سمجھنا موقوف ہے اور اس ہی سے ان مشکل اعتراضات کا جواب حاصل ہے جو دین پر کئے گئے ہیں۔ اس لئے ناظرین اس کو نہایت غور سے مطالعہ کریں۔

پہلا مقدمہ

۱۔ یعنی خداوند عالم محمود مطلق ہے اس لئے اس سے قبیح فعل صادر نہیں ہو سکتا کیونکہ فعل کی برائی فاعل کی ذات کی برائی ہے۔ جیسے جو چوری کرتا ہے وہ چور

ورنہ ایک جاہل بدکار و ظالم پر عطائے نعمت ظلم ہوگا یعنی بے جا کام۔ عدل کا یہی تقاضا ہے کہ جو جس درجہ کا مستحق ہو وہ اس کو دیا جائے۔ عدل کے معنی ہیں حق بہ حقدار رسانیدن۔ پس جس نے علمی اور اخلاقی ترقی کی یعنی تحصیل معرفت اور عمل خیر کیا تو چونکہ معرفت کیساتھ عمل خیر طاعت الٰہی ہے۔ اس لئے وہ عطائے الٰہی کا مستحق ہوا۔

دوم بالاستحقاق نعمت پانا عزت نفس ہے اور عزتِ نفس انسان کا سب سے بڑا مطلوب ہے جس طرح ذلت سب سے زیادہ ناگوار ہے۔

بلا استحقاق نعمت پانا ایک ذلیل درجہ ہے۔ اس کی مثال بہائم و علف زار سے ہے (جیسے ایک بیل جو سبزہ زار میں چر رہا ہے) ایسے انسان کا درجہ بہائم سے زیادہ نہیں۔

سبب ابتلا

یہ وجہ ہے کہ انسان کو چند روزہ حیات دیکر ابتلا میں ڈالنا ضروری ہوا تاکہ وہ اس حیات میں بہتر درجہ حیات کی اہلیت اور استحقاق پیدا کرے۔ ابتلاء کے معنی ہیں باوجود مزاحم کے کسی کام پر مامور ہونا ایک طرف خواہشات نفسانی عمل خیر کی مزاحم ہیں، دوسری طرف دنیا کے مصائب و الام سدّراہ۔ اس حال میں انسان عمل خیر پہ مکلف ہوا تاکہ ذاتی کمال یا قدر و منزلت اور اس طرح قربت الٰہی پیدا کرے۔ ایسی مشکلات میں جو شخص راہ مستقیم پر قایم رہا اس کو حیات جاودانی میں ہر نعمت اور ہر مطلوب کی عطا بالکل بجا ہوگی۔

دوسرا استدلال!

دنیا یعنی انسان کا ماحول اس کا سامان تربیت ہے جیسا کہ آگے ثابت

وہ نفع کیا ہے

چونکہ ذات کامل خیر مطلق ہے اس لئے اس سے شر صادر نہ ہوگا۔ اس لئے جس خیر کا ارادہ اس نے انسان کے لئے کیا ہے وہ شر سے خالی ہوگا۔ خیر محض ہوگا۔

خوف و رنج شر ہیں۔ اس لئے جس نفع یا خیر کا ارادہ کیا ہے وہ ایسی حیات ہے جس کا خوف و رنج سے خالی ہونا ضروری ہے حیات اس لئے کہ بغیر حیات کے کسی کو نفع پہونچ نہیں سکتا۔

اس لئے انسان کے لئے ضرور ایسی حیات مقصود ہے جو خوف و رنج سے خالی ہو اس لئے وہ حیات جاودانی ہوگی اور اس میں ہر مطلوب حاصل ہوگا جاودانی اس لئے کہ اگر ختم ہونے والی ہو تو خوف مرگ عارض ہوگا۔ لیکن اس حیات میں خوف نہیں ہو سکتا۔ اور ہر مطلوب اس لئے حاصل ہوگا۔ کہ اگر کوئی مطلوب حاصل نہ ہوا تو وہ سبب رنج ہوگا۔

پس انسان کو خداوند عالم نے اس غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ ایسی حیات جاودانی حاصل کرے جس میں اس کا ہر مطلوب حاصل ہو۔ ظاہر ہے یہ حیات کا درجہ موجودہ حیات سے برتر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ عطائے نعمت اس کے لئے ہی جس میں اس کی اہلیت ہو اور جس کو اس کا استحقاق ہو۔

ہو کہ ذات کامل دو ہیں یا چار خواہ یہ کہ ذات کامل موجود نہیں ہے
اس لئے ان دیگر مذاہب کے حامیوں نے اگر کچھ ان کے ثبوت میں دلائل پیش کئے ہیں تو وہ ظنی اور مغالطہ امیز ہیں۔ جیسا کہ مذاہب باطل کی بحث سے آگے عیاں ہوگا۔

ایک اعتراض کا رد

وہ اعتراض یہ ہے۔ اگر خداوند عالم کو یہ منظور تھا کہ انسان دین حق اختیار کرے تو چاہیئے تھا کہ یہ امر اور دین حق کا مفہوم انسانوں پر واضح اور روشن ہوتا تاکہ وہ اس کو باسانی اختیار کر سکتے۔ لیکن اس کے خلاف ہم دیکھتے ہیں کہ انسان طرح طرح کے اوہام اور باطل عقائد میں مبتلا ہیں۔
اور وہ اپنے اپنے مذہب کو حق سمجھتے ہیں اور ان میں اکثر ایسے ہیں جو تحقیق اور استدلال نہیں کر سکتے۔
اس کے علاوہ اگر تحقیق عقلی سے دین حق قطعاً ثابت ہوتا تو حکماء و فلاسفر جن کا دارومدار تحقیق علمی پر ہے سب کے سب دین حق پر ہوتے لیکن ایسا نہیں ہے لہذا ثابت ہے کہ انسان کے لیے دین حق کا اختیار کرنا مطلوب نہیں ہے۔

جواب

اول یہ کہ دین حق کا اختیار کرنا ہر انسان پر واجب نہیں ہے صرف ایسے لوگوں پر واجب ہے جو ترقی علم و تمدن سے اس درجہ پر پہونچے کہ تحقیق عقلی و استدلال سمجھ سکیں۔ جو اس سے معذور ہیں ان پر اسلام لانا واجب نہیں اور چونکہ تحقیق کرنے سے اکتساب فضیلت ہوتا ہے اور انسان بہتر درجہ حیات کا مستحق ہوتا ہے اس لیے مذہب حق کا مفہوم اور ثبوت تحقیق اور اکتساب پر موقوف رکھا ہے تاکہ وہ علمی ترقی کا وسیلہ ہو اور یہ بڑی غرض افرینش ہے تحقیق

کیا ہے اور اعمال فطرت اس سامان کی مسلسل فراہمی میں سرگرم ہیں اور اس سامان تربیت پر انسان کا مسلسل تصرف اس کی علمی و اخلاقی ترقی کا سبب ہوا ہے جیسا کہ مشاہدہ اور تاریخ سے عیاں ہے۔ دوسری طرف انسان میں اس علمی و اخلاقی ترقی کی صلاحیت بھی رکھی ہے۔ لہذا خداوند عالم ہماری تربیت کا ارادہ رکھتا ہے یعنی ہمارا مربی ہے۔ اور یہ حیات زمانہ تربیت ہے

لیکن ہر مربی مربوب کو اس لئے تربیت کرتا ہے کہ اس کو بہتر درجہ حیات پر پہونچائے۔ ورنہ فعل تربیت عبث ہے اور حکیم سے فعل عبث محال ہے۔ اس لئے ہماری تربیت کا مقصود ہمکو بہتر درجہ حیات تک پہونچانا ہے لہذا حیات آخرت یقینی ہے۔

دین حق

پس تحقیق سے ثابت ہے (۱) کہ ذات کامل (خدا) موجود ہے (۲) اور انسان کو اس نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ معرفت و اخلاق میں ترقی کر کے اس اعلیٰ درجہ حیات کی اہلیت و استحقاق پیدا کرے جس کا ارادہ خدا نے اس کے لئے کیا ہے (۳) اس لئے موت کے بعد ایک اور حیات ہے اور وہ جاودانی ہے

دوسرے اعتراض کا رد

یہاں سے ظاہر ہے کہ دین حق ایک تحقیقی اور یقینی اعتقاد ہے۔ نہ وہ روایات پر مبنی ہے اور نہ وہ ظنی یا وہمی بات ہے۔

دین حق کیخلاف لوگوں نے جو وہمی اور ظنی مذاہب قایم کئے ہیں وہ یقیناً باطل ہیں کیونکہ جو بات ثابت اور یقینی ہے تو اس کے خلاف کا باطل ہونا ضروری ہے مثلاً اگر ذات کامل ایک ہے تو اس کے مخالف ہر قضیہ کا باطل ہونا لازم ہے بخواہ وہ یہ

موجود ہے یہاں سے ثابت ہے کہ انسان میں مذہب کیطرف فطری رجحان ہے۔ علاوہ بریں غور کیجئے تو دین حق کی اصل صرف یہ ہے کہ انسان کو صحیح فکر اور صحیح عمل کرنا چاہیئے اور اس پر تمام انسانوں کو اتفاق ہے ۔

علمی ترقی کیساتھ دین حق کا ادراک

تمدن علم کی کے ساتھ مذاہب میں بہت کچھ ترمیم و تہذیب ہوئی ہے ۔ چنانچہ مختلف مذاہب میں جیسے ہندو، عیسائی و بدھ مذہب میں توحید کی طرف رجحان بڑھتا جارہا ہے ہندوؤں میں آریہ سماج ۔ عیسائیوں میں یونیٹیرین حتیٰ کہ بدھوں میں ہنایان خدا کے وجود کے قائل ہوئے ہیں

دین حق کا حاصل کرنا بذریعہ اکتساب کے ضروری ہے کیوں کہ اکتساب باعث فضیلت و استحقاق ہے اس لئے ضرور تھا کہ دین حق کا مفہوم بندوں پر بدیہی ہو بلکہ نظری رہے انسان کے ابتلا اور تربیت کی یہی غرض ہو کہ وہ اپنی سعی سے علمی و اخلاقی ترقی کر کے اعلیٰ درجہ حیات کا مستحق بنے ۔ اس لئے ایک طرف تو اس میں مذہب کیطرف فطری رجحان رکھا ہے پھر طریقہ تحقیق پر دین حق کو روشن و واضح کردیا ہے ذات باری کا مخفی وجدان اس کو فطرتاً حاصل ہے ۔ ابتداً فطرت میں وہ بہت سے دیوتا ماننے کے بعد بھی وہ ان میں سے ایک کو اعلیٰ ترین معبود قرار دیتا ہے مشرکین کے مذاہب میں یہ رجحان دیکھ کر میکس مولر Max Muller نے اس کا نام Henotheism رکھا ہے ۔

اس کے سوا اخلاقی پابندی کا حکم دینا ہمارے ضمیر کا دائمی کام ہے ترقی علم کی خوبی پر انسانوں کو اتفاق ہے علمی و اخلاقی ترقی دین حق کی اصل الاصول ہے ۔

ذات باری ادراک حسی سے برتر ہے اور حیات اخرت آیندہ ہونے والی ہے ۔ اس لئے ان تک صرف عقل کو رسائی ہے اس کے سوا کوئی راہ نہیں

تمام حکمائے ہندو یونان و یورپ اس پر متفق ہیں کہ انسان کا کمال دو

اگر محض اتباع عقل کے ساتھ ہوتی ہے تو حتماً حق تک پہونچاتی ہے لیکن اگر انسان اپنے تعصبات میں مبتلا رہے یا اپنی خواہش و پسند کو صحیح قرار دے لے تو وہ تحقیق سے صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔ جن تحقیق کرنیوالوں نے اپنے باطل عقائد کو بنا قرار دے کر تحقیق کی وہ تولا محالا غلط نتائج پر پہونچتے ہیں فلاسفہ و حکماء میں بہت سے جن کی عظمت کا سکہ عالم پر بیٹھا ہوا ہے اپنی تحقیق میں دین حق تک پہونچے ہیں متقدمین میں سقراط و افلاطون اور زینوں اور ان کے اتباع صانع عالم کے وجود کے قائل، حیات دنیا بعد اس کے الام و مصائب کو وسیلہ تربیت مانتے ہیں اور حیات آخرت کے قائل ہیں، متاخرین میں کانٹ ہیگل، ڈیکارٹ اسی مذہب پر ہیں۔ اس کے خلاف ایسے فلسفی بھی رہے ہیں جو اپنے ابتدائے تعصبات سے نہ نکل سکے اور ان غلط مفروضات پر فلسفہ کا نظام قائم کیا جس کا باطل ہونا لابدی تھا ان کی ایک نمایاں مثال گوتم بدھ کی ہے جن کا یہ ابتدائی تعصب قائم رہا کہ انسان بار بار جنم لیتا ہے یعنی تناسخ واقع ہے بار بار جنم کا سبب بد اعمالی ہے۔

وہ اس تحقیق کے درپے ہوئے کہ جنم کے چکر سے کیوں کر نجات ہو۔ انہوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ جو کچھ حس سے محسوس ہے وہی موجود ہے عقل کوئی شے نہیں ورنہ عقلی بات قابل اعتبار۔ اس کے خلاف ان کے مباحث میں عقلی استدلال بہت کچھ ہے یہ پہلا تناقض ہے اس نظریہ کی بنا پر انہوں نے خدا اور روح اور مادہ کے وجود سے انکار کیا۔ کیوں کہ وہ حواس سے محسوس نہیں لیکن جب روح نہیں ہے تو تناسخ کیسا؟ کیوں کہ ایک ہی روح کے بار بار جنم لینے کا نام تناسخ ہے دوسرا تناقض ہے باوجود اس کے وہ اپنے اس اعتقاد سے نہ ہٹے کہ تناسخ واقع ہے کیوں کہ یہ اعتقاد ابتدا سے سن سے قائم تھا۔

انسان میں دین حق کی طرف فطری رجحان

تمام اقوام عالم میں خواہ وہ وحشی قبائل ہوں یا متمدن مذہب ضرور

کو پورا کیا ہے جس کے صلہ میں خداوند عالم اسپر اتمام نعمت فرمائے گا یا منشاء الٰہی کے خلاف انسان جہالت اور بدکاری سے اپنے کو مرتبہ بہایم سے بھی نیچے گرا دے تو اس کی اہلیت کے مطابق اس کو ذلت اور عذاب کی زندگی دے تو ضروری ہے کہ خداوند عالم کا یہ وعدہ ہم تک پہونچے تا کہ ہم کو مزید وثوق حاصل ہو اور جاہل اور بدکار کو تنبیہ آئے کہ وہ عذاب آخرت میں مبتلا ہو گا تا کہ اس کے لئے یہ عذر نہ ہے کہ خداوند اتو نے مجھے پہلے سے کیوں نہ آگاہ کیا پس کہ خداوند عالم کا کلام ہماری طرف نازل ہونا ضروری ہے جس میں یہ وعدہ اور وعید ہو اور اس کے ساتھ یہ بیان بھی کہ معرفت دین تحقیق سے حاصل کرو اور یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو اچھے کام کا یہ ثواب ہے اور برے کا یہ عذاب ان احکام کے آنے کا ایک فائدہ مزید وثوق ہی دوسرے تنبیہ اور تیسرے حجت تمام کرنا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے احکام آئیں تا کہ ہم اس کی اطاعت کر سکیں کیوں کہ اپنے خالق و مربی کی اطاعت افضل ترین عمل ہے۔ اور کسی کی اطاعت بغیر اس کے احکام آئے ممکن نہیں کیوں کہ تعمیل احکام ہی کا نام اطاعت ہے۔

چوتھا فائدہ یہ کہ جب ان معارف کا بیان کتاب اللہ میں آ گیا جن تک ہم کو تحقیق سے پہونچنا ہے تو اب تحقیق حق آسان ہو جائے گی۔

پانچواں فائدہ اور سب سے اہم نفع یہ ہے کہ احکام الٰہی کے نزول سے بندے طاعت الٰہی بجا لانے پر متمکن ہو گئے کیوں کہ کسی کی اطاعت ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب اس کے احکام ہم تک پہونچیں اور یہ طاعت زیادتی قربت کا سبب ہے اور قربت معبود و بندہ کا سب سے بڑا مطلوب ہے قربت الٰہی سے مراد خداوند عالم کی نظر میں بندہ کی قدر و منزلت ہونا ہے اور ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اس کے مالک و مربی کی نظر میں اس کی وقعت ہو۔

کتاب اللہ کی ضرورت پر دوسرا استدلال

(۱) ہماری اس حیات کا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ حیات کا استحقاق

باتوں پر موقوف ہے ایک یہ کہ علم کو علم کے واسطے حاصل کرے اور عمل کے لئے امر حق معلوم کرے۔

دین حق کا اختیار کرنا صرف مستطیع تحقیق پر واجب ہے

چونکہ دین حق تک پہونچنا صرف تحقیق عقلی سے ممکن ہے اور تحقیق عقلی پر سب انسان قادر نہیں اس لئے دین حق کا اختیار کرنا صرف مستطیع تحقیق پر واجب ہے لہذا یہ اعتراض ساقط ہے کہ بہت سے انسان تحقیق عقلی پر قادر نہیں یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب انسان کے پیدا کرنے غرض یہ ہے کہ اس کو حیات کا اعلیٰ درجہ دیا جائے لیکن جب زیادہ انسان جاہل رہے تحقیق پر قادر ہی نہ ہوئے۔ وہ مر گئے اور اس درجہ پر نہ پہونچے تو پھر یہ کہنا کیوں کر درست ہے کہ غرض آفرینش انسان کو بہتر درجہ حیات عطا کرنا ہے۔

جواب

قرآن مجید یہ جواب دیتا ہے کہ جو لوگ بچپن میں مر گئے۔ مجنون یا جاہل مرے ان کو آخرت میں دوبارہ پیدا کر کے بہتر صلاحیت کے ساتھ پھر ترقی کا موقع دیا جائے گا وہ اعراف میں رہیں گے اس کے بعد وہ داخل جنت ہوں گے اس کا بیان سورہ اعراف میں ہے جس کی تفصیلی بحث آگے آتی ہے۔ اور جہلا میں سے وہ لوگ جنھوں نے بدکاری زیادہ کی ان کو ان کے اعمال کی پوری سزا دے کر پھر اعراف میں تکمیل کا موقع دیا جائے گا۔

حاصل یہ ہے کہ انسانوں کو پیدا کر کے ان کی تکمیل نفس اور انعام آخرت کی طرف لے جایا جا رہا ہے اور یہ غرض بالآخر تمام انسانوں کے لئے حاصل ہوگی

اب اگر خداوند عالم نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ علمی وعملی ترقی کرے یعنی اپنے خالق اور انجام کی معرفت حاصل کرے اور اپنی غرض آفرینش

معنی سے بولا جاتا ہے۔

کتاب اللہ کی وضع اور اسکی خصوصیات

کتاب میں ضروری ہے کہ احکام ہمکو دیئے گئے ہوں کہ یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو۔ مخاطب کی تخصیص ہو۔ ورنہ ان کی تعمیل ہم پر واجب نہ ہو گی۔

(۱) اسلئے کتاب اللہ میں وہ احکام بندوں کو دیے گئے ہوں۔

(۲) اور خداوند عالم نے بصیغہ متکلم کلام کیا ہو۔

(۳) اور وہ احکام اس طرح بیان فرماتے ہوں کہ ہم ان کی مراد یقین کے ساتھ سمجھ سکیں یعنی کلام جامع و مانع ہو مبہم نہ ہو ورنہ تعمیل واجب نہ ہو گی۔

(۴) اور وہ کلام کسی معروف زبان میں ہوتا کہ اس کے بولنے والے براہ راست سمجھ لیں۔ اور دوسری قومیں اس زبان کو سیکھ کر سمجھ سکیں۔

(۵) اسلئے ان کلام کے بیان میں اس زبان کے محاورہ کا پورا تتبع ہو

(۶) اور اس بیان کی مراد قرائن کلام سے اسی طرح ظاہر ہو جیسے ہر زبان میں لوگ قرائن سے معین کر لیتے ہیں۔

(۷) اور اس کتاب کے احکام ذاتی فضائل کے اکتساب کا ذریعہ ہوں

(۸) ان احکام کی تعمیل کی جزا میں حیات جاودانی کے ساتھ اتمام نعمت کا وعدہ ہو اور خلاف ورزی پر عذاب آخرت کی وعید ہو۔

(۹) اس کتاب میں یہی دین حق بیان کیا گیا ہو جو اوپر دلیل عقلی سے ثابت کر لئے ہیں

(۱۰) اس دین کا علم و یقین دلیل لفظی سے حاصل کرنے کا حکم ہو۔

(۱۱) اور وہ کتاب ہم تک ایسے شخص کے ذریعہ سے پہونچی ہو جو خدا کی طرف سے اس کے احکام پہونچانے پر مامور ہوا ہو (یعنی رسول ہو) جو یہ بتائے کہ یہ کتاب اللہ ہے (یعنی شاہد ہو) تاکہ ہم اس کے کلام اللہ ہونے کی تحقیق کریں

۱۲۔ اور اس کتاب میں ایسی نشانیاں ہوں جن سے اس کا کلام اللہ ہونا یقین

پیدا کریں۔ اور وہ صرف عمل صحیح سے پیدا ہوتا ہے منجملہ تمام اعمال خیر کے اطاعت الہٰی سب سے افضل ہے:

اطاعت الہٰی اسکے احکام کی تعمیل ہے۔

۲۔ چونکہ ذات باری خیر مطلق ہے وہ اعمال خیر ہی کا حکم دیتا ہے اور اعمال خیر ہی سے باقی فضائل پیدا ہوتے ہیں۔

یعنی اطاعت الہٰی ہر فضیلت پیدا کرتی ہے اس لئے اعلیٰ درجہ حیات کا استحقاق پیدا کرتی ہے

لہٰذا ہماری حیات کا مقصد حاصل ہونا اطاعت الہٰی پر موقوف ہوا جس کے لئے کتاب اللہ یا احکام الہٰی کا آنا ضروری ہے۔ اس لئے خداوند عالم پر واجب ہے کہ وہ اپنے احکام نازل فرمائے اور ان کی تعمیل ہم سے متعلق کرے کیوں کہ بغیر نزول احکام اطاعت الہٰی ممکن نہ ہوگی۔

احکام الہٰی کا مجموعہ کتاب الہٰی کہلاتا ہے پس
نزول کتاب اللہ کی ضرورت ثابت ہے۔

کلام اللہ کی مراد

اللہ تعالیٰ کا کلام کس معنی سے کلام ہے؟

کلام وہ بامعنی آواز ہے جو انسان کے منہ سے اس کے ارادہ اور قدرت سے نکلے؟

جواب یہ ہے کہ خداوند عالم بامعنی آوازیں اپنے ارادہ اور قدرت سے کسی جسم میں خلق کر دیتا ہے۔ (جیسے انسان گراموفون یا ریڈیو میں آوازیں پیدا کر لیتا ہے)

چونکہ وہ آوازیں خداوند عالم کے ارادہ اور قدرت سے پیدا ہوتی ہیں جن سے وہ مخلوق تک اپنے احکام پہونچاتا ہے لہٰذا وہ اس کا کلام ہیں یعنی کلام اللہ مجازی

کی قوت کے اندر ہے ۔

۳۔ دیگر محاسن کلام کو اس کثرت سے جمع فرمایا ہے کہ سوائے عالم مطلق کے غیر کی قدرت سے خارج ہے ۔

۴۔ تالیف مضامین کے ایسے حیرت انگیز اسالیب صرف ہوئے جو سوائے عالم مطلق کے اور کسی سے ممکن نہیں ۔

قرآن میں ان امور کا موجود ہونا تفصیل سے آگے ثابت کیا ہے ۔

معنی تفسیر اور ضرورت تفسیر

۱۔ قرآن مجید نے التزاماً اور تضمناً مطالب کثیرہ پر دلالت کی ہے ۔

۲۔ ان مدلولات کو واضح کر کے فہم عامہ کے روبرو لانا ضروری ہے ۔

۳۔ عام خیال یہ ہے کہ قرآن مجید مبہم اور ناقص الدلالت ہے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کا جامع و مانع ہونا ثابت کر دیا جائے ۔

۴۔ قرآن مجید کا اعجاز عیاں کرنے کو ضروری ہے کہ اسکی تالیف کے وہ حیرت انگیز اسالیب سامنے لائے جائیں جو اب تک خاص و عام کی نظر سے مخفی رہے ۔

قواعد تفسیر

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ قرآن مجید محاورہ عرب کے مطابق ہے اور ہونا چاہیئے تھا ۔ اس لئے اسکی تعبیر انہیں قواعد کے مطابق ہونا چاہیئے ۔ جن سے ہم کلام عرب کی تعبیر کرتے ہیں تعبیر کے یہ دو قاعدے ہیں اور وہ سب زبانوں کے لئے عام ہیں ۔

ایک یہ کہ کلام کے معنی اہل زبان کے محاورہ کے تتبع کے ساتھ کرے یعنی لفظ اور جملے کے وہی معنی لو جس معنی سے اہل زبان ایسے محل پر بولتے ہیں ۔

دوسرے یہ کہ قرائن حالی اور مقالی سے اسکی مراد متعین کرے ۔

کے ساتھ معلوم ہو سکے۔

(۱۳) اور وہ کتاب ایسے وقت نازل ہوئی ہو جب کہ اور کوئی کتاب اللہ موجود نہ ہو یا سابق کتاب مفقود یا مسخ ہو گئی ہو۔

(۱۴) اور اس کا نزول ایسی قوم پر ہو جس میں تحقیق حق کی استطاعت پیدا ہو چکی ہو

(۱۵) اس کتاب کا دعویٰ ہو کہ وہ الہامی کتاب ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس کا نزول عبث ہوگا۔

قرآن مجید کا کتاب اللہ ہونا

یہ جو وہ اوصاف یا خصوصیات قرآن مجید میں موجود ہیں اور ناظرین قرآن پہ ان میں سے اکثر عیاں ہیں۔ اس لئے قرآن مجید کا کتاب اللہ ہونا ثابت ہے ان میں سے ہر وصف کا قرآن مجید میں موجود ہونا ہم نے آگے واضح اور عیاں کیا ہے

قرآن مجید حسن بیان کا معجزہ ہے

منجملہ ان نشانیوں کے جن سے قرآن مجید کا کتاب اللہ ہونا ثابت ہے ایک اس کا اعجاز بیان ہے

قرآن چار جہت سے حسن بیان کا معجزہ ہے۔ اور ان چاروں جہات سے قرآن کا معجزہ ہونا خود قرآن میں بیان ہوا ہے۔

اول اختصار عبادت کے ساتھ اس قدر معانی کثیر پر دلالت کی ہے۔ کہ اس کی مثل طاقت بشر سے باہر ہے۔

دوم :۔ قوانین اور مسائل حکمت کو محاورہ عام میں۔ بغیر صرف اصطلاحات جامع مانع عبارات میں بیان فرمایا ہے کہ نہ اس کی مثال ہے اور نہ اس کی مثل مخلوق

نادانستہ کی ہے۔ اُس نے اسلام کے رد میں ایک کتاب لکھی اور پوری کتاب میں یہ دکھایا کہ قرآن مجید میں جن عقائد و اعمال کی تعلیم ہے وہ اکثر و بیشتر سابق اور قدیم ترین مذاہب میں جابجا پائے جاتے ہیں۔ اس لئے قرآن میں کوئی جدت نہیں ہے، بلکہ وہ انہیں مذاہب سے ماخوذ ہے۔ پس یہ ایسی کتاب ہے جس کو ایک واقف انسان تالیف کر سکتا ہے اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کے لئے الہام کی ضرورت ہو۔ اس اعتراض کا رد یہ ہے کہ قرآن مجید نے خود تصریح کی ہے کہ اسلام وہی قدیم مذہب ہے جو ابراہیمؑ اور نوحؑ کا تھا۔

نزول قرآن کی ضرورت جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا یہ تھی کہ انسانوں کو احکام الٰہی ایسی مستند صورت میں پہونچ جائیں کہ وہ ان کو احکام خدا جان سکیں اور اطاعت الٰہی بجا لا سکیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا صحیفہ مفقود ہو چکا تھا۔ توریت و انجیل علاوہ مسخ ہو جانے کے صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی۔ اس لئے جدید کتاب اللہ کی ضرورت تھی جس کو قرآن مجید نے پورا کیا۔ اور یہ بات کہ قرآن مجید کی تعلیم کے اجزا قدیم مختلف ادیان میں پائے جاتے ہیں خود ہمارے نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ دین حق ابتداءً بنی آدم پر نازل ہوا تھا۔ جب اولاد آدم مختلف ممالک میں منتشر ہوئی تو وہ دین حق کی تعلیم لے کر نکلی۔ اس کے بعد امتداد زمان اور اختلاف آرا سے ان میں بعض باطل عقائد اور اعمال نے رواج پایا۔ پھر بھی دین حق کے بعض عقائد اور اعمال ان میں باقی رہ گئے اور رہ جانا چاہیئے تھے۔

پس ظاہر ہوا کہ معترض نے جن امور کو اسلام کے رد میں پیش کیا ہے وہ درحقیقت اسلام کی تائید کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے آنحضرتؐ کے تاریخی واقعات پر محققانہ نظر کی ہے وہ اسی نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ قرآن مجید شریعت الہامی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹ نر کی تحقیق یہ ہے:-

"مذہب یہود و نصاریٰ کا جہاں تک مجھے علم ہے اسکی بنا پر یہ نظر

دین حق کی عالمگیری

اگر اسلام یا دین حق اختیار کرنے ہی سے انسان اپنی حیات کے مقصد کو پہونچ
سکتا ہے تو ضرور ہے کہ خداوند عالم نے اس دین کی کتاب انسانوں پر ابتدا سے
نازل کی ہو تاکہ انسان اپنے مقصد حیات کو حاصل کر سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ہے۔
قرآن مجید نے تصریح کی ہے کہ اسلام وہی دین ہے جو ابراہیمؑ کا تھا۔ اور
ابراہیمؑ نوحؑ کے پیرووں میں سے تھے۔ یعنی اسلام کوئی جدید مذہب نہیں ہے
بلکہ خدا کی طرف سے اس دین کے اتباع کا حکم شروع سے آ رہا ہے۔ چنانچہ
انگلستان کے ایک فاضل عیسائی کی یہ شہادت ہے۔

"اسلام کیا ہے؟ اس سوال کا بہترین اور مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام
خالص یہودی مذہب ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ یہودی مذہب صرف بنی اسرائیل
کے لئے تھا اور اسلام تمام اقوام عالم کے لئے ہے۔ یا اسلام اصل عیسائی مذہب ہے
بشرطیکہ مذہب عیسوی سے پولس کی تعلیم کو نکال دیا جائے۔ محمدؐ کا خیال تھا کہ
دین ابراہیم کے منافع صرف اپنی قوم میں محدود نہ رکھیں بلکہ ان کو دنیا کے لئے
عام کر دیں۔ اس طرح ان کے وسیلہ سے کروروں انسانوں کو تہذیب و تمدن کے
اعلیٰ درجہ پر پہونچا دیں کہ بغیر اس کے یہ اقوام پست وحشیت اور بربریت میں رہتیں
اور اس اخوت کے درجے پر نہ پہونچتیں جس کی اسلام نہ صرف تلقین کرتا ہے
بلکہ جس پر عامل بھی ہے۔"

P.293. G. W. Leitner, in Religious Systems of the World.

مذہب یہود و نصاریٰ اور اسلام میں توحید و عدل و رسالت و معاد
بطور اصول دین کے مسلم ہیں۔

ہمارے نظریہ کی تائید مصر کے ایک معروف فاضل جرجی زیداں نے

اور یہ امانت اس قدر بیش بہا ہے کہ اسکی بدولت انسان اس درجہ قدر و منزلت پر پہونچ سکتا ہے جس تک جن و ملک کو رسائی نہیں۔

۸۔ جس بندہ نے اپنے مالک کی اس بیش بہا امانت کو ضائع کر دیا یعنی جہالت اور بدکاری سے اپنے کو درجہ بہائم سے نیچے گرا دیا وہ بڑی سے بڑی سزا کا مستحق ہوا۔ جو آخرت میں اس کے لئے تیار ہے

۹۔ اگر یہ انعام اور سزا معین ہے تو ضرور ہے کہ خداوند عالم کا وعدہ انعام اور وعید عذاب ہم تک آئے تاکہ ہمارے مزید وثوق کا سبب ہو اور حجت تمام ہو۔

۱۰۔ اس کے ساتھ ان احکام کا بیان بھی ہو جن کے صلہ میں انعام ہے اور جن کی خلاف ورزی پر عذاب۔

۱۱۔ احکام الٰہی آنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم اطاعت الٰہی کر سکیں کیونکہ کسی کی اطاعت بغیر اس کے احکام کے ممکن نہیں۔

۱۲۔ خداوند عالم اور بندہ کے مابین علاقۂ خالق و مخلوق اور مربی و مربوب واقع ہے اس علاقہ سے لازم آتا ہے کہ بندہ خدا کی اطاعت کرے۔ اس لئے اطاعت الٰہی واجب ہوئی اور بہترین عمل خیر ہے

۱۳۔ یہی اطاعت وسیلہ قربت الٰہی ہے۔ یعنی مالک کی نظر میں بندہ کی قدر و منزلت اور یہ بندہ کا سب سے بڑا مطلوب ہے۔

۱۴۔ چونکہ محمود مطلق کے احکام صرف عمل خیر ہی سے متعلق ہو سکتے ہیں اور عمل خیر استکمال نفس ہے۔ اس لئے طاعتِ الٰہی استکمال نفس کا وسیلہ ہے اور اسی طاعت پر بہتر حیات کا ملنا موقوف ہے۔

۱۵۔ لیکن اطاعت الٰہی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ بندہ کو بالیقین احکام الٰہی معلوم ہوں۔

۱۶۔ محض ظن و گمان پر کسی کام کو حکم الٰہی سمجھ کر کرنا اطاعت الٰہی نہیں ہو سکتا

آتا ہے کہ محمدؐ نے جس دین کی تبلیغ کی وہ نہ ان مذاہب کی نقالی ہے نہ مختلف مذاہب سے خوشہ چینی۔ اگر وہ ذات جو ہر خیر کا مبدا ہے الہام کرتی ہے تو اسلام الہامی مذہب ہے۔ میں باوجود عجز کے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر ایثار نفس۔ دیانت قصد۔ اپنی رسالت کا کامل یقین۔ موجودہ غلط کاریوں اور بُری راہوں پر حیرت انگیز عمیق نظر اور ان کی اصلاح کے بہترین وسائل کا انتخاب' الہام کی ظاہری اور واضح نشانیاں ہیں تو محمدؐ کی رسالت الہامی تھی"

P. 293. Religious Systems of the world.

دین حق کی مزید توضیح

ثابت ہوا کہ

۱۔ ذاتِ کامل نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ انسان استکمال نفس کرے۔

۲۔ تاکہ وہ اس سے بہتر درجہ حیات کا اہل اور مستحق بنے جو اس کے لئے آمادہ ہے۔

۳۔ استکمال نفس کیا ہے؟ علمی اور اخلاقی ترقی۔

۴۔ ہماری علمی ترقی کا مرجع اپنے خالق کی اور مقصد حیات کی معرفت ہے۔

۵۔ اور عمل میں خیر کا اختیار کرنا اور اس کا مسلسل التزام رکھنا اخلاقی ترقی ہے۔

۶۔ اس ترقی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان پر اتمام نعمت کیا جائے گا۔

۷۔ خداوند عالم نے اس ترقی کی صلاحیت انسان میں رکھی ہے۔ چنانچہ بہت لوگ یہ ترقی کرتے ہیں۔

یہ صلاحیت خداوند عالم کی امانت ہے جو اس نے ہمارے سپرد کی ہے،

سابق شریعتوں میں بھی دین حق کا یہی مفہوم ہے۔ عام اس سے کہ وہ دین ابراہیمی تھا یا موسوی یا عیسوی

بعض لوگ شاید اس میں تامل کریں لیکن غور کریں تو اس دعوی کی صحت ظاہر ہو گی۔ مذہب عیسوی کے اصول (Cardinal Principles) دیکھیے یا توریت کا مطالعہ کیجئے۔ اصول اسلام پر نظر کیجئے۔ ایمان باللہ (توحید و عدل) ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت سب کو مسلم ہیں ان عقائد کی بنا پر یہ سوال کرو کہ خدا نے انسان کو کیوں پیدا کیا اور اس کو اپنے احکام کیوں بھیجے۔ تو جواب یہی ہے۔ تاکہ انسان اطاعت الہی کرے اور اس کی جزا میں جنت پائے توریت کی عبارت ہے کہ "غرض شریعت اطاعت ہے"

اب یہ سوال کیجئے کہ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ خدا انسان کو بغیر اطاعت اور اس آلام و مشقت کی زندگی کے جنت عطا کر دیتا۔ تو جواب یہ ہے کہ عطائے جنت سے مراد اتمام نعمت ہے۔

اور بغیر اس ابتلا کے تمام نعمات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ سب سے بڑی نعمات فضائل ذاتی اور قربت الہی ہیں۔ اور یہ بغیر ہمارے اکتساب کے ممکن نہیں۔ خدا کی نظر میں ہماری قدر و منزلت بلاوجہ نہیں ہو سکتی اور وہ فضائل کے اکتساب پر موقوف ہے۔ اور ذاتی فضائل حکمت و شجاعت و عفت اور راہ خدا میں ایثار نفس ہیں۔

اس لئے یہ حیات دنیا ضروری ہوئی کہ اس میں احکام الہی بندوں سے متعلق ہوں اور ان کی تعمیل پر وہ بالاستحقاق مدح و تعظیم کے ساتھ مورد نعمات ہوں۔ بغیر اس کے اگر باغ جنت میں رکھ دئے جاتے تو انسانوں کی وہی ذاتی قدر و منزلت ہوتی جو علف زار میں بہائم کی ہے۔ ایسے

۱۷۔ اس لئے کہ ہر مذہب والا (ہندو۔ عیسائی پارسی) بعض اعمال کو احکام الہٰی گمان کر کے بجا لاتا ہے۔

۱۸۔ پس اگر ظن و گمان پر اطاعت درست ہو تو لازم آئیگا کہ ہر مذہب والا عین اطاعت الہٰی میں مشغول ہو اور مثل مومن کے ثواب آخرت کا مستحق ہو لیکن یہ غلط ہے۔ اس لئے ظن پر عمل کرنا اطاعت الہٰی نہیں ہو سکتا

۱۹۔ اس لئے واجب ہے کہ اول کتاب اللہ کے کتاب اللہ ہونے کا یقین بالدلائل حاصل کرے۔

۲۰۔ اور قرآن مجید کے مطالعہ سے خدا کے احکام بالیقین معلوم کرے

دین حق کے متعلق انسان کے فرائض

اول۔ اپنے آغاز و انجام کے بارہ میں تحقیق کرنا یعنی اپنے خالق اور مقصد حیات کی معرفت حاصل کرنا۔

دوم۔ قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کا علم و یقین دلیل قطعی سے حاصل کرنا۔

سوم۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے اس کے معارف اور احکام کا علم و یقین حاصل کرنا

چہارم۔ احکام فرعیہ کی تعمیل بہ نیت قربت کرنا۔

ظاہر ہوا کہ دین حق کا اتباع اکثر و بیشتر تحقیق اور تحصیل علم ہے چنانچہ قرآن مجید کے بارہ حصوں میں سے گیارہ حصے تعلیم معرفت ہے اور ایک حصہ میں اعمال فرعیہ کا بیان ہے۔ یعنی تقریباً ۶۲۰۰ آیات میں سے صرف پانچ سو آیات میں احکام فرعیہ ہیں۔ یہاں سے ظاہر ہوا کہ ضروری عقائد کا یقین بہم پہونچانا اور اس یقین کے مطابق عمل کرنا دین حق ہے۔

مقدمۃ القرآن

یہ مقدمہ خود قرآن مجید میں بطور مقدمہ کے دیا ہوا ہے۔ ناظرین قرآن کو اس بات پر حیرت ہوگی کہ قرآن مجید میں اس کا مقدمہ بھی موجود ہے۔ اور یہ مقدمہ اس قدر جامع و کامل ہے کہ اس کتاب کی کئی جلدوں میں اس کا مسلسل بیان ہے۔

مقدمۃ الکتاب کیا ہے اور اسکی کیا ضرورت ہے؟

ہر اہم کتاب میں مصنف کتاب کی نوعیت اور خصوصیات ابتدا ہی میں بیان کر دیتا ہے تاکہ اس کے مطالب سمجھنے میں ناظرین کو آسانی ہو جائے یہی کتاب کا مقدمہ ہے۔ مقدمہ میں کتاب کی نوعیت۔ غرض تصنیف۔ مصنف کے وہ احوال جن کا اثر تصنیف پر ہوا ہو۔ کیفیت تصنیف۔ کتاب کے ماخذ اور استناد۔ طرز بیان ترتیب مباحث۔ موضوع کی تحدید اور مخاطبین کی تخصیص بیان کر دیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایسی چند خصوصیات ہیں کہ بجائے ان آٹھ دس باتوں کے اس کے مقدمہ میں تقریباً ایک سو امور کا ذکر مقدمۃ ضروری ہوا ہے اور ان سب کا بیان اس میں موجود ہے۔ اسکی یہ جامعیت اور تکمیل شاہد ہے کہ وہ حکیم مطلق کا کلام ہے۔ مقدمہ کے لئے دو باتیں ضروری ہیں ایک یہ کہ وہ کتاب کی ابتدا میں ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں کتاب کی عام کیفیات اور خصوصیات کا بیان ہو۔

مقدمۂ قرآن کا ابتدائے کتاب میں واقع ہونا

قرآن مجید کا ہر سورہ ایک مستقل صحیفہ ہے۔ چنانچہ فی صحف مکرمۃ

انسان نہ کسی قدر و منزلت کے لائق ہوتے نہ کسی مدح و تعظیم کے مستحق۔ ان کا درجہ اُن بہائم کے درجہ کے برابر ہوتا۔ اس طرح ہمارا مطلوب حاصل نہ ہوتا۔ اس لئے یہ چند روزہ حیات ابتلا و تکلیف و مشقت کے ساتھ ضروری ہوئی۔ اس چند روزہ زندگی کے آلام بمقابلہ حیات جاودانی اور تمام اُخروی نعمتوں کے اس قدر خفیف ہیں جیسے کسی کو ایک گلاس پانی پلانے کے عوض میں سلطنت ہند کی عطا کرے۔ اتنے عظیم نفع کے لئے ان چند روزہ آلام و مصائب اٹھانے کے لئے ہر عاقل کا آمادہ ہونا یقینی ہے۔ اس لئے اس دنیا کی حیات اور اس میں ہم کو مکلف کرنا تکلیف حسنہ ہے۔ یہاں یہہ سوال ہوگا کہ اگر دین حق یہی ہے تو کیا وجہ کہ عموماً علمائے اسلام اس کے خلاف نظرے بیان کرتے ہیں؟

جواب۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام میں بہت فرقے ہیں۔ لیکن یہہ سب اصول دین یعنی ایمان باللہ۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد میں متفق ہیں اور ان اصول سے دین حق کا یہی مفہوم لازم آتا ہے جس کو ابھی ہم نے ثابت کیا ہے۔ ضلالت کے اسباب بہت ہیں۔ قدیم تعصبات۔ غلط فہمی۔ باہمی عناد طلب دنیا۔ جاہل فریبی وغیرہ وغیرہ۔

۱۹۔ لوح محفوظ میں اس کا اول ظہور
۲۰۔ لوح اور عرش اور ان کے وجود پر عقلی دلیل۔
۲۱۔ عالم بالا میں اس کے اول ظہور کی ضرورت۔
۲۲۔ اس کے کلام خدا ہونے کے دلائل۔
۲۳۔ کتاب اللہ کی وضع کا عقلاً مشخص ہونا۔
۲۴۔ نبیؐ کا اسکی تصنیف پر بالوجوہ قادر نہ ہونا۔
۲۵۔ قرآن مجید کا کلام سلف نہ ہونا۔
۲۶۔ معاصرینِ رسول میں سے کسی کا اسکی تصنیف پر قادر نہ ہونا۔
۲۷۔ قرآن مجید کسی جن کا کلام نہیں ہو سکتا۔
۲۸۔ لوح محفوظ سے اسکو کوئی جن اخذ نہیں کر سکتا۔
۲۹۔ کوئی فرشتہ اسکو بغیر اذن الٰہی لوح سے لاکر نہیں دے سکتا۔
۳۰۔ جبرئیلؑ نے قرآن کو لوح سے اخذ کیا اسکو پڑھا اور اس کا تلفظ لوح سے سنا۔
۳۱۔ دو طریقے پر اخذ کرنے کی ضرورت۔
۳۲۔ اخذ کر کے جبرئیلؑ نبی کے پاس آتے اور قریب کھڑے ہو کر سناتے تھے۔
۳۳۔ نبیؐ کلام پورا سنکر اسکو دہراتے تھے اور جبرئیلؑ اپنا اطمینان کرلیتے تھے کہ کلام صحیح صحیح نبیؐ کے ذہن تک پہونچ گیا۔
۳۴۔ رسالتِ جبرئیل کا استناد
۳۵۔ جبرئیل نے نبیؐ کو کس طرح پہچانا۔
۳۶۔ نبیؐ پر حفظ قرآن کا واجب ہونا۔
۳۷۔ نبیؐ پر اور سب اربابِ فہم پر قرآن کو عقل سے سمجھنے کا وجوب۔
۳۸۔ نبیؐ پر قرآن کو کتابت میں لانے کا وجوب
۳۹۔ نبیؐ پر احکام قرآن کے اتباع کا وجوب

بایدی سفرۃ کرام بررۃ میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے ۔ اور قرآن مجید کی ہر خصوصیت کا بیان عموماً سورتوں کی ابتداء میں واقع ہے ۔ اور یہی خصوصیات یا عام کیفیات مقدمہ کا موضوع ہیں ۔ چونکہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے ۔ ہدایت خلق کے لئے آیا ہے ۔ بذریعہ وحی نازل ہوا اور بواسطۂ رسول ہم تک پہونچا ہے ۔ لہذا ان خصوصیات کی وجہ سے اس میں حسب ذیل امور کا بیان مقدمتہً ضروری ہوا ہے ۔

۱۔ کتاب کی نوعیت

۲۔ موضوعِ بحث

۳۔ کتاب کی ضرورت

۴۔ کیفیت وحی

۵۔ ماہیت الہام

۶۔ رویائے صادقہ

۷۔ کتاب کے متعدد اغراض

۸۔ ترتیب مطالب

۹۔ اسالیب بیان

۱۰۔ بیان کا مدلل ہونا

۱۱۔ کتاب کا واضح و مبین ہونا

۱۲۔ توضیح مقال کے وسائل

۱۳۔ کلام جامع و مانع ہے ۔

۱۴۔ کلام کو جامع و مانع بنانے کی صنعتیں ۔

۱۵۔ مطالب کثیر کا عبارات قلیل میں بیان کرنا ۔

۱۶۔ منزل من اللہ ہونے کے ثبوت میں صورت اعجاز اختیار کرنا ۔

۱۷۔ اعجاز کی متعدد جہات ۔

۱۸۔ اس کا کلام خدا ہونا ۔

۶۳۔ وحی منزل کی ترتیب

۶۴۔ سورہ کے ایک جزکے بعد دوسرے جزکے نزول میں تاخیر کے وجوہ۔

۶۵۔ نزول کی ابتدا کب ہوئی اور اول سورہ

۶۶۔ نبیؐ کو کیونکر یقین ہوا کہ یہ کلام خدا ہے۔

۶۷۔ نبیؐ کو اپنے نبی ہونے کا یقین کن وجوہ پر ہوا۔

۶۸۔ نبیؐ کو کیونکر یقین ہوا کہ قرآن مجید باذن الہٰی ان پر نازل ہوا۔

۶۹۔ آپ نے جبرئیل کو دیکھا۔ آواز سنی، اور کسی نے نہ دیکھا نہ سنا۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔

۷۰۔ اوروں سے خفائے جبرئیل کی مصلحت۔

۷۱۔ کلام الہٰی کا بلفظہا کلام الہٰی ہونا کیوں ضروری ہے۔

۷۲۔ یہ کلام بہ صورت صحیفۂ مکتوب کیوں نہ نازل ہوا۔

۷۳۔ فرشتہ کو نبی کیوں نہ بنایا۔

۷۴۔ عالم بالا سے بذریعۂ ملک قرآن کے نزول کی ضرورت۔

۷۵۔ نبیؐ پر تبلیغ قرآن کا وجوب۔

۷۶۔ دائرہ تبلیغ کی تحدید مکانی

۷۷۔ کیفیت تبلیغ۔

۷۸۔ استناد رسالت نبیؐ۔ قرآن مجید نبیؐ نے صحیح و سالم امت کو پہونچا دیا۔

۷۹۔ قرآن مجید کا امت کے درمیان صحیح و سالم موجود ہونا ضروری ہے۔

۸۰۔ بعد نبیؐ کے قرآن مجید کے امت کے درمیان صحیح و سالم موجود رہنے کی صرف دو صورتیں ممکن تھیں۔

۸۱۔ ایک یہ کہ بعد نبی ان کی مثل ایک معصوم اس کا حافظ و حامل رہے۔ اور اس معصوم کے بعد ایک اور معصوم وعلیٰ ہذا یہاں تک کہ قرآن مجید کو کثرت اشتہار سے تواتر حاصل ہو جائے۔ یا نبیؐ اپنے اصحاب میں سے پندرہ بیس اشخاص

۴۰ نبیؐ پر واجب تھا کہ احکام الٰہی کی تعمیل کی بہترین صورت تجویز کریں۔
۴۱۔ قرآن مجید کا عربی زبان میں محاورۂ قریش پر ہونا۔
۴۲۔ قرآن مجید کا محاورۂ عام پر ہونا اور اصطلاحات سے خالی ہونا۔
۴۳۔ تعریف آیات
۴۴۔ قواعد تعبیر کا قرآن مجید میں بیان۔
۴۵۔ قرائن مراد کا بیان
۴۶۔ استنباط احکام کے ضوابط
۴۷۔ ایمان بالقرآن کی تعریف اور ایمان بالقرآن کا وجوب
۴۸۔ اتباع قرآن کا وجوب
۴۹۔ اس کا ہر بیان صادق اور ہر حکم حق ہے۔
۵۰۔ وہ انتہائی ارشاد کے لئے کافی ہے۔
۵۱۔ تحکیم بالقرآن واجب ہے۔
۵۲۔ اس کا منزل من اللہ ہونا تحقیقی امر ہے۔
۵۳۔ قرآن مجید قرات واحد پر نازل ہوا ہے
۵۴۔ وہ عالمگیر شریعت ہے
۵۵۔ وہ تاقیامت نافذ ہے
۵۶۔ وہ ناسخ ادیان ہے
۵۷۔ ناسخ و منسوخ۔
۵۸۔ محکم و متشابہ
۵۹۔ قرآن کی اہمیت
۶۰۔ ترتیب نزول
۶۱۔ تدریجی نزول اور اسکی ضرورت
۶۲۔ اس کا سورتوں پر مشتمل ہونا اور سورتوں کا آیات پر۔

۹۵۔ قرآن مجید کے مخاطبین۔

۹۶۔ از روی تاریخ قرآن کی اس خبر کا سچا ظاہر ہونا کہ یہ امت قرآن سے غافل رہے گی۔ جمع قرآن کی بحث اس مقدمہ کی شرح وبسط و جامعیت محیر العقول ہے۔ ناظرین اسکی تفصیل آگے مطالعہ کریں اور قرآن کی عظمت کا اندازہ کریں۔ قرآن مجید کے اس مقدمہ کے بیان پر ۲۵۴ آیات ہیں۔ تمام مطالب کی ابتدار تو انھیں آیات سے ہوئی ہے جو سوروں کی ابتدا میں ہیں۔ لیکن ان کی مزید تفصیل بعض ضرورتوں کے سبب درمیانی آیات میں بھی جا پڑی ہے۔ ان ضرورتوں کو ہم نے آگے بیان کیا ہے۔

ضرورت احکام الٰہی و وحی

۱۔ احکام الٰہی کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ ہم اطاعت الٰہی کر سکیں۔

۲۔ اطاعت الٰہی اس لئے ضروری ہے کہ اپنا مقصد آفرینش حاصل کر سکیں۔

۳۔ ذی عقل مخلوق (جن وانس وملک وغیرہ) کے پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ علمی و اخلاقی ترقی سے بہتر درجۂ حیات حاصل کریں۔

۴۔ اطاعت الٰہی سے تمام فضائل ذاتی پیدا ہوتے ہیں، اس لئے کہ احکام الٰہی سے بیک وقت حقوق خالق و مخلوق کے ادا ہوتے ہیں جو عدل ہے۔ اور مخلوق کے ساتھ احسان ہوتا ہے اور عدل واحسان میں تمام افعال خیر شامل ہیں۔

۵۔ حکمت وشجاعت وعفت بھی اعمال خیر کی سہ گانہ تقسیم ہے لہٰذا اعمال خیر ہی علمی و اخلاقی ترقی کا ذریعہ ہیں۔

۶۔ **حکم کی تعریف :۔** حاکم جائز کا وہ کلام جس میں محکوم سے کسی فعل یا ترک فعل کی طلب ہو حکم ہے۔

۸۔ پس احکام الٰہی ہم تک پہونچنے کے لئے اللہ کا کلام ہم تک آنا بہت ضروری ہے۔

کا ایک بورڈ قائم کرنے اور ان میں سے ہر ایک کو پورا قرآن لکھا دیتے اور پڑھا دیتے اور حفظ کرا دیتے اور اس کے ساتھ متواترا اعلان کرتے رہتے کہ مسلمان ان لوگوں سے قرآن حفظ کریں اور اخذ کریں اور ان سے اسکی تصحیح کرلیں ۔ ان دو میں سے ایک اہتمام اللہ و رسول پر واجب تھا۔

۸۳ - بعد نبیؐ اصحاب رسول میں سے کسی کے پاس نہ پورا قرآن مکتوب تھا نہ کسیکو پورا یاد تھا۔ نہ کسیکو معلوم تھا کہ پورا قرآن کس قدر ہے ۔

۸۴ - قرآن مجید میں قرآن کے بارہ میں امت کی غفلت اور خطا کاری کی خبر۔

۸۵ - چونکہ نبیؐ نے حفاظت قرآن کا اہتمام بذریعہ اصحاب نہیں کیا۔ اس لئے ثابت ہے کہ حفاظت قرآن کا اہتمام بذریعہ سلسلہ معصومین واقع ہوا۔

۸۶ - اللہ تعالیٰ کا وعدہ حفاظت قرآن اور اسکی مراد۔

۸۷ - خداوند عالم کا بعد نبیؐ قرآن کو ایک سلسلہ معصومین کے سپرد فرمانا تاکہ وہ امت کے درمیان محفوظ رہے ۔

۸۸ - ان کو قرآن بعینہ درست حفظ یاد ہونے کا قرآن میں اعلان ۔

۸۹ - قرآن میں یہ اعلان کہ ان کے پاس قرآن مکتوب ہے جس کا جی چاہے اُن سے لے ۔

۹۰ - یہ اعلان کہ وہ معصومین قرآن اسی طرح پڑھتے تھے جیسا کہ نبیؐ نے پڑھا ۔

۹۱ - یہ اعلان کہ یہ معصومین قرآن کو نبیؐ سے یکے بعد دیگرے ورثہ میں پائیں گے ۔

۹۲ نبیؐ نے کس کے حق میں یہ اعلان کیا کہ قرآن کو ان سے حاصل کرو۔

۹۳ - معصوم کو بعد نبیؐ قرآن جمع کرنے کا حکم ۔

۹۴ - یہ ممکن نہ تھا کہ قرآن امت کے درمیان ناقص شائع ہو اور اس کے نقص کا اعلان معصومین نہ کریں ۔

کلام کو ذہن میں محفوظ رکھے اور بلاکم وکاست بندوں تک پہونچا دے۔ اور اُن پر پورا عمل کرکے ان کی مراد واضح کردے۔ اس لئے اس کا ہر قول وفعل عین صواب ہو۔ اسی معنی سے وہ معصوم ہے اپنے فطری میلان خیر سے (جو تمام انسانوں میں کم وبیش ہوتا ہے) وہ ابتدائی سن شعور سے خیر کا جویاں اور شر سے محترز رہتا ہے۔ چنانچہ ابتدا سے جب وہ کسی فعل کی برائی یا بھلائی میں متردد ہوتا ہے تو خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور الہام الٰہی اسکو فعل خیر کی طرف رہنمائی کرتا ہے یعنی معصوم ابتدا سے مورد الہام الٰہی ہوتا ہے۔ (دیکھو دفعہ ۳)

دفعہ ۳۔ وحی اور الہام کی ماہیت

انسان اپنا مافی الضمیر دوسرے پر چار طرح ظاہر کرسکتا ہے :۔

۱۔ کلام۔ خواہ صوتی ہو یا مکتوب

۲۔ اشارہ سے۔ بہت سے اشارات (جیسے جھنڈیوں سے یا سرخ وسبز روشنی سے) ایسی ہیں جن کی مراد پہلے بذریعہ کلام کے معین کرلی جاتی ہے۔

۳۔ کسی جسم میں آواز پیدا کرکے جیسے ریڈیو یا گراموفون، اس کے لئے بھی پہلے کلام ضروری ہوتا ہے۔

۴۔ انتقال خیال۔ یہ طریقہ قدیم سے منقول ہے، لیکن جدید تحقیقات سے زمانۂ حال میں پایۂ ثبوت کو پہونچا ہے۔ اسکی پوری کیفیت اور ثبوت اس دفعہ کے آخر میں دی ہوئی ہے۔ اجمالاً یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ذہن میں بلا کلام یا اشارہ کے اپنا خیال پہونچا دیتا ہے۔ اسکو انتقال خیال کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو مشق سے یہ قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔

۵۔ لیکن اس طریقے سے صرف ہمارا ایک تصور یا خیال دوسرے کے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسکی صحت یا یقین اس کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔ محض ایک خیال ہے جو ذہن میں آگیا۔ جیسے یکایک ہم کو گلاب کا خیال آگیا۔ یہی

۸۔ ذات باری جسم و جسمانیات سے منزہ ہے' اس کے نہ دہن ہے نہ آواز لیکن وہ اپنی قوت و ارادہ سے کسی جسم میں آواز پیدا کر دیتا ہے۔ یہی اس کا کلام ہے۔

۹۔ چنانچہ ملائکہ جن کا وجود جن و انس سے پہلے ہوا اسیطرح اس کے احکام کے مخاطب ہوئے کہ لوح محفوظ سے آواز پیدا ہوئی۔ جس جسم میں اس نے یہ کلام پیدا کیا اس کا نام عرش ہے (یعنی تخت) نام کی مناسبت یہ ہے کہ بادشاہ تخت پر بیٹھ کر احکام نافذ کرتا ہے۔ عرش کے کنارہ پر تختہ کی مانند حاشیہ ہے وہ ملائکہ کے سامنے ہے اسی تختہ بندی کا نام لوح محفوظ ہے (لوح یعنی تختہ)۔ خداوند عالم کا کلام لوح پر بصورت تحریر بھی ظاہر ہوتا ہے اور اس کے تلفظ کی آواز بھی پیدا ہوتی ہے۔ ایک روحانی (جبرئیل) اس کے معائنہ میں کچھ دور سے مشغول رہتا ہے اور جس کے لئے احکام صادر ہوتے ہیں ان کو پہونچاتا ہے۔

۱۰۔ متعدد وجوہ سے یہ ضروری ہے کہ احکام الہٰی انسانوں کو بذریعہ برگزیدہ انسان کے پہونچیں (ان وجوہ کو ہم نے آگے بیان کیا ہے)

۱۱۔ ضروری ہے کہ وہ انسان احکام الہٰی کے سمجھنے' یا در کھنے اور پہونچانے میں خطا نہ کرے اگر اس سے خطا کا احتمال رہے تو احکام کا احکام الہٰی ہونا یقینی نہ ہوگا اور نہ بندوں پر ان کی تعمیل واجب ہوگی۔ اس لئے غرض رسالت فوت ہو جائے گی۔ لیکن حکیم مطلق کا فعل بیکار نہیں ہوسکتا۔ لہذا ایسا شخص نبی بنایا جاتا ہے جسکا ہر قول و فعل عین صواب ہو۔

اس لئے انسانوں میں ایسا شخص منتخب کیا جاتا ہے جو ابتدائے سن سے فعل خیر کی جانب مائل ہو اور اس قدر ذہین و عاقل و حکیمانہ روش پر ہو کہ جب وحی اس پر نازل ہو تو وہ پہلے ہی اپنے تفکر سے معرفت دین حاصل کر چکا ہو اور اسکو احکام الہٰی کی ضرورت اور ان کے بذریعہ وحی آنے کا علم ہو۔ تاکہ جب وحی آئے تو وہ ان کو پہچان لے کہ یہ احکام الہٰی ہیں' ان کو بخوبی سمجھے۔

ما کان لبشر ان یکلمہ	کسی بشر کے لئے ممکن نہیں ہے
اللہ الا وحیا او من وراء	کہ اللہ کلام کرے اس سے
الحجاب او یرسل رسولا	سوائے (تین صورتوں کے)
فیوحی باذنہ مایشاء	اشارہ سے (یعنی الہام) یا حجاب کے پیچھے سے یا کسی سفیر کو بھیجے تو وحی کی جائے۔ اس (اللہ) کے اذن سے وہ بات جسکو اللہ چاہے۔

بشر کے لئے اُس تک منشائے ایزدی پہونچنا صرف تین طریقے سے ممکن ہے۔

ایک اشارہ سے۔ یعنی الہام یا رویائے صادقہ۔

دوسرے کلام من وراء الحجاب سے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی جسم میں آواز پیدا کردے تو وہ جسم حجاب رہتے درمیان اللہ اور انسان کے۔

تیسرے:۔ وحی بذریعہ جبرئیل کے کہ وہ لوح سے کلام الٰہی اخذ کرکے نبی تک پہونچا دے۔

یہاں سے ہم ناظرین کو آیاتِ قرآن مجید کی اعلیٰ معنویت اور کثرتِ دلالت کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ آیت معرفت کے پانچ مستقل الباب کھولتی ہے، جن کو ہم اس بحث میں تفصیل سے بیان کریں گے۔

اس آیت نے اس مطلب پر بھی دلالت کی ہے کہ خداوند عالم نے جن انسانوں سے کلام کیا وہ انھیں تین طریقوں پر کیا۔

الہام کی صورت ہے۔

احکام الٰہی کا بندوں تک پہونچنا

اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ احکام الٰہی ہم کو صرف اس کے کلام ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اشارہ یا الہام کافی نہیں۔

بذریعۂ کلام احکام الٰہی ہم کو اس طرح پہونچنا ضروری ہیں کہ ان کی مراد صاف صاف معلوم ہو۔ اور یہ یقین حاصل ہو سکے کہ یہ خدا ہی کے احکام ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہوا کہ خداوند عالم اپنا کلام کسی جسم میں پیدا کرے۔

وجود عرش و لوح پر عقلی دلیل

یہاں سے عرش و لوح کے وجود پر عقلی دلیل حاصل ہے۔ احکام الٰہی ہم کو پہونچنا ضروری ہے۔

لہٰذا کلام الٰہی کا کسی جسم سے ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اسی جسم کا نام عرش ہے اور اس کے حاشیے یا کنارے کا نام لوح ہے۔

چوں کہ اس جسم اور حاشیہ کو قرآن مجید میں عرش و لوح فرمایا ہے یعنی تخت اور تختہ۔

اور کلام خدا کا صادق ہونا ضروری ہے۔

لہٰذا عرش کا بہ ہیئت تخت ہونا اور لوح کا تختہ یا حاشیہ ہونا ثابت ہے۔

مذکورۂ بالا مطالب کی توضیح قرآن مجید میں اس طریقے سے وارد ہوئی ہے۔

شوریٰ ۵

الا وحیا او من وراء الحجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاء۔

کلام کرے۔ سوائے تین طریقوں کے اشارہ کے یا من ورائے حجاب یا بھیجے ایک پیغمبر پس وہ وحی کیا جاتا ہے اذن سے اس (اللہ) کے اس بات کی جو (اللہ) چاہے

وکذالك اوحینا الیك روحا من امرنا۔ ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان ولکن جعلناہ نورا یهدی به من یشاء من عبادنا وانك لتهدی الی صراط مستقیم

تو اسی طرح ہم نے اشارہ کیا تیری طرف ایک روحانی کو اپنے امر کا۔ تو نہ جانتا تھا کہ حکم یا ایمان کیا ہے لیکن ہم نے اس اشارہ (الہام کو) ایک نور بنایا ہے جس سے ہم ہدایت کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور (چنانچہ اسی ہدایت کی بدولت) بہ تحقیق تو ہدایت کرتا ہے صراط مستقیم کی طرف۔

آیات کی توضیح

وکذالك۔ اور اسی طرح۔ یعنی جس طرح ہم نے اور انسانوں (معصوموں) سے کلام کیا کہ وہ کلام الہام۔ وحی۔ وراء الحجاب کلام تھا اسی طرح ہم نے اشارہ کیا تیری طرف ایک روحانی (جبریل) کو اپنے امر ہدایت کا اس وقت جس کے پہلے تو ایمان و حکم کے معنی بھی نہ سمجھتا تھا (یعنی اب سن شعور آ گیا تھا .... اور یہ وہ نور ہدایت ہے جو تم کو ہر زمانہ میں راہ مستقیم دکھاتا رہا۔ قبل از بعثت اور بعد از بعثت اب کہ نصف قرآن نازل ہو چکا ہے مگر تم اس ہدایت کی بدولت لوگوں کو عین صراط مستقیم ہی کی ہدایت کرتے ہو۔

اس آیت میں الہام کرنے کو منتقل کیا ہے زمانہ بے شعوری کے

الہام کی کیفیت

جب معصوم کسی فعل کی برائی یا بھلائی میں متردد ہوتا ہے اور اس کی فکر کسی قطعی نتیجہ تک نہیں پہونچتی تو اللہ تعالے لوح محفوظ میں ضروری ہدایت پیدا کر دیتا ہے اور جبرئیل امین اس کا تصور اپنے ذہن میں لے کر معصوم کے ذہن میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اور وہ تصور ایسا امر ہوتا ہے جو معصوم کی فکر کو قطعی نتیجہ تک پہونچا دیتا ہے۔ پس الہام کے وقت معصوم خود اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ایک اشارہ اس کی ہدایت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور وہ اشارہ ایسا تصور ہوتا ہے جو سابقاً کسی موقع پر اس کو حاصل ہو چکا ہے معصوم کے قوائے ذہنیہ زبردست ہوتے ہیں اور میلان الی الخیر قوی ہوتا ہے معصوم بمقابلہ عوام جلد ترسن شعور کو پہونچ جاتا ہے۔

لیکن چونکہ معصوم ہمارے ساتھ نوعیت بشری میں متحد ہے اس پر بھی ابتداء میں بے شعوری کے وہ تمام مدارج گذرتے ہیں جو اور انسانوں پر گذرتے ہیں۔ چنانچہ طفلی میں معصوم پر ایک زمانہ ایسا ہوتا ہے جبکہ وہ ایمان اور حکم کے معنی ہی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہیں۔

لیکن جب وہ سن شعور کو پہونچتا ہے رہنمائی عقل سے ہدایت کا طالب رہتا ہے اور اسی وقت سے وہ موئد بہ الہام ربانی رہتا ہے مذکورہ بالا آیت کے بعد والی آیت اس مطلب کو بالتصریح بیان کرتی ہے

دونوں آیتیں ملا کر یوں ہیں:۔

شوری ۵۰

ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ   بشر کے لئے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے

اعمال خیر کا۔

خداوند عالم نے جن کو امام بنایا وہ خدا کے حکم سے ہدایت خلق کرتے تھے۔ چونکہ خدا نے ان کو ہدایت کا حکم دیا اس لئے ان کی ہدایت کا عین ثواب ہونا ضروری تھا۔ اس لئے تائید الہام ان کے لئے ضروری تھی۔ آیت میں ان کا مورد الہام ہونا اس وصف کے ساتھ بیان ہوا کہ وہ ہدایت کے لئے مامور من اللہ تھے۔ لہذا یہی صفت علت ہوئی الہام ہونے کی ہدایت تائید الہام سے کلیتہً راست و درست ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں آنحضرتؐ کے لئے فرمایا کہ اسی نور کے سبب تم صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتے ہو۔

اب رہا اس کا ثبوت کہ معصوم جب کسی فعل کے بارہ میں متردد ہوتا ہے تو اسی صورت میں الہام ہوتا ہے۔ تو وہ یہ ہے کہ واوحینا الیہم فعل الخیرات میں فرمایا " ہم نے الہام کیا ان کو کارہائے خیر کرنے کا" یعنی یہ الہام صرف نیک کام کرنے کے بارہ میں تھا۔ اور چونکہ خود معصوم کے نیک کام کرنے کا ذکر ہے اور معصوم جس کام کو نیک جانتا ہے اس کو بلا تامل اختیار کرتا ہے اس میں کسی ایما اور اشارہ کا محتاج نہیں لہذا ثابت ہوا کہ اشارہ الہام وہیں حاصل ہوا جہاں معصوم کو فعل کے بارہ میں تردد تھا۔

اول الذکر آیت کے اس جز نے فیوحی باذنہ مایشاء (پس وحی کی جاتی ہے اس کو (اللہ) کے اذن سے جس بات کو کہ وہ (اللہ) چاہے) معرفت کا ایک نیا باب کھولا ہے۔ وہ یہ کہ خداوند عالم چونکہ اپنے علم و قدرت کے اعتبار سے ہر جگہ حاضر و ناظر ہے وحی میں ہر بات اس کی مشیت کے مطابق ہی ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے اسی کو وحی ہوتی ہے اور جس بات کو وہ چاہتا ہے اسی کی وحی ہوتی ہے۔ فرشتہ

ذکر سے اس کی مثال یہ ہے۔ زید نے عمر سے کہا "میں تم سے ہوشیار رہتا ہوں ایک زمانہ تھا کہ میں تمہاری دشمنی سے غافل تھا"
اس کلام کی صاف صاف مراد یہ ہے کہ جب سے مجھ پر تمہاری دشمنی ظاہر ہوئی اس وقت سے میں سے ہوشیار رہتا ہوں۔
پس نبیؐ کے لئے یہ وحی یا اشارہ الہامی طفلی میں ابتدائے سن شعور سے واقع ہوا۔ اس سے قبل ایک زمانہ مثل شیر خواروں کے بے شعوری کا گزرا اور یہ معلوم ہے کہ وحی رسالت آنحضرتؐ پر جوانی کے بعد شروع ہوئی پس ثابت ہے کہ یہ وحی یعنی الہام تھی۔

اس آیت سے آنحضرتؐ کو ابتدائے سن شعور سے الہام ہونا ثابت ہے اور نہ صرف آپ کو بلکہ ہر معصوم کو۔ کیونکہ یہ آیت اپنی سابق آیت سے بذریعہ حرف مماثلت کے مربوط ہے یعنی وکذالك سے (اسیطرح) اور اسی طرح اللہ نے تمہاری طرف ایک روحانی کو اشارہ کیا جبکہ سن شعور کی استعداد تھی۔ یعنی الہام کیا۔ چونکہ حرف مماثلت طرفین میں یک رنگی قائم کرتا ہے۔ لہذا نبیؐ اور دیگر معصومین کا اس امر میں مماثل ہونا ثابت ہے پس چونکہ نبیؐ کو سن شعور کی ابتدا میں الہام ہوا لہذا ہر معصوم کو ابتدائے سن شعور سے الہام ہونا ثابت ہوا۔

الہام کا انبیا کے علاوہ ائمہ کو بھی ہونا

اسکی دلیل یہ ہے:-

وجعلنهم ائمۃ یھدون بامرنا واوحینا الیھم فعل الخیرات	اور ہم نے ان کو امام بنایا کہ ہدایت کرتے تھے ہمارے حکم سے اور الہام کیا ہم نے ان کو

نے احکام الٰہی بتایا یقیناً احکام الٰہی ہیں کیونکہ خداوند عالم کسی ملک و جن کو اس بات پر قادر نہ رکھے گا کہ وہ کسی صالح کو ایسے احکام پہونچا دے جو درحقیقت احکام الٰہی نہ ہوں یا جن کا بھیجنا اس صالح کی طرف خدا کو منظور نہ ہو۔

وہ دلائل جن سے نبی کو اپنے نبی ہونے کا علم ہوتا ہے

انسانوں میں بعض اطفال ابتداء سے نیکی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ برے کاموں سے ان کو جھجک ہوتی ہے۔ اور بعض غور و فکر پر مائل ہوتے ہیں۔ انھیں میں ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی فکر سے مسائل عقلیہ کا انکشاف کیا اور وہ حکیم و فلسفی مشہور ہوئے۔ ہدایت خلق کے لئے خداوند عالم ایسے ہی لوگوں کو چنتا ہے جن میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ اپنے عمل سے امت کے لئے مثال ہو سکیں اور اپنی تعلیم سے ان کی رہبری کر سکیں۔ چنانچہ معصوم کی خصوصیات میں سے ایک احتیاط ہے جو اس میں ابتدا سے ہوتی ہے۔ احتیاط کی ضد بے باکی و بے پروائی ہے احتیاط کا دوسرا نام تقویٰ ہے اس معنی سے یہ لفظ قرآن میں بار بار آیا ہے۔ معصوم کی دوسری خصوصیت غور و فکر ہے وہ ابتدائی عمر میں ان منازل سے عبور کر جاتا ہے جن تک حکماء آخر میں پہونچتے ہیں۔ اس پر وجود باری دلائل قطعیہ سے منکشف ہوتا ہے وہ اس کا محمود مطلق ہونا جانتا ہے یعنی اس کی ذات ہر صفت کمال سے موصوف ہے وہ آگاہ ہوتے ہیں کہ محمود مطلق کی غرض تخلیق انسان سے صرف انسان کی نفع رسانی ہے اس لئے انسان میں جس مرتبہ کمال تک پہونچنے کی صلاحیت ہے اس کمال تک اس کو پہونچانا منظور ہے اور اس کی یہی راہ ہے کہ وہ اطاعت

جو معصوم ہے وحی پہونچاتا ہے اور خداوند عالم اس کی صحت کا نگراں رہتا ہے چونکہ وحی ہدایت سے متعلق ہے اور ہدایت بندوں کی اطاعت سے اور اطاعت الہی انسان کی غرض آفرینش ہے اس لئے یہ ایسا کار اہم ہے کہ باری تعالی کی نگہداشت اس کی صحت کی ضامن ہے۔ اپنے احکام بھیجنا اللہ تعالی کے ذمہ ہے۔ اطاعت بندوں کی ذمہ ہے۔ لہذا احکام کا بندوں تک پہونچانا ایسے مستحکم اہتمام سے ضروری ہے کہ اس میں غلطی نہ ہو سکے۔

چونکہ خداوند عالم کا کسی معصوم کو حکم دینا اس فعل کے واقع ہونے کی حتمی دلیل ہے اس لئے کہ معصوم خطا نہیں کرتا

جس صراط پر اللہ کو منظور ہے کہ اس کے بندے چلیں اس کی طرف رہنمائی کا اہتمام کامل ہے چنانچہ سابق آیت کے بعد ہی یہ آیت آتی ہے۔ سابق آیت ختم ہوئی اس جملہ پر۔

وانک لتھدی الی صراط مستقیم صراط اللہ الذی لہ ما فی السموات والارض الا الی اللہ تصیر الامور	بیشک تو ہدایت کرتا ہے صراط مستقیم کی طرف اللہ کی صراط پر جو مالک ہے اس کا جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کیا نہیں ہے تمام امور کی رجوع اللہ کی طرف۔

توضیح

جس راستہ پر اللہ کو چلانا منظور ہے اس کی طرف کامل رہنمائی ہے اور جو کچھ امور عالم میں واقع ہوتے ہیں اللہ تعالی کے اذن سے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سب کا مرجع اسی کی ذات ہے یہی وہ دلیل ہے جس کی بنا پر بندہ کو یقین ہے کہ ہم تک احکام الہی ضرور صحیح و سالم پہونچے۔ اس نگرانی کی وجہ سے ذات باری اپنے وجود سے نبی پر شاہد ہے کہ یہ احکام جو اس کو دیے گئے اور جن کو دینے والے

پر وحی لائے ہیں چنانچہ قرآن مجید میں اس شہادت کا بیان یہ ہے:۔

تنزل الملائکۃ والروح	اور ہم جو کچھ نازل کرتے ہیں وہ صرف
فیہا باذن ربہم	تیرے رب کے حکم سے وہ سب
ومانتنزل الا بامر ربک	اللہ کے لئے ہے جو ہم آئندہ کریں
لہ ما بین ایدینا وما خلفنا	گے اور جو پہلے کیا اور جو کچھ ان کے
وما بین ذالک۔ وما	درمیان ہیں (کرتے ہیں) اور
کان ربک نسیا۔	تیرا رب بھولنے والا نہیں۔

دوسری دلیل

نبی کو بعثت سے پہلے تصوبت بالملائیکہ ہوتی ہے یعنی ملائکہ سے ملاقات اور گفتگو۔ اس طرح وہ ان سے اور ان کی اطاعت الہیٰ سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ وہ جنوں کو بھی دیکھتا ہے اور دونوں کی نوعیت میں اسی طرح امتیاز کرتا ہے جس طرح ہم اونٹ اور گھوڑے میں امتیاز کرتے ہیں وہی ملائکہ جن سے واقفیت ہو چکی ہے روح الامین کے ساتھ آکر مذکورہ بالا شہادت دیتے ہیں۔ سورۂ قدر میں جو نزول قرآن کی ابتداد بیان کرتی ہے روح الامین کے ساتھ ملائکہ کے آنے کا حال اس طرح بیان ہوا ہے۔

تنزل الملائکۃ و	ملائیکہ نازل ہوئے اور روح
الروح فیہا باذن ربہم	الامین اس (رات) میں اپنے رب کے حکم سے

الٰہی میں عمل خیر کرے۔ اس اطاعت کے لئے احکام الٰہی کا نا ضروری ہیں۔ اور بندوں تک اپنے احکام پہونچانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ اس لئے جس کو وہ نبی بناتا ہے اس میں ایسے اور ایسے صلاحیت ہونا چاہئے اور اس پر نزول احکام ایسے محکم طریقہ پر ہوگا کہ خلل واقع نہ ہو۔ مفہوم یہ جو اصول دلیل عقلی سے ثابت ہیں وہی کتاب الٰہی میں ہونا چاہئیں۔
چنانچہ جب نبوت کی ابتدا ہوئی اور سورہ فاتحہ آپ پر نازل ہوا تو اس میں وہی اصول تھے اور اس کلام کا کلام الٰہی ہونا آپ پر عیاں تھا خدا کی قدرت و علم۔ جو عالم پر محیط ہے خود اس بات کی شاہد ہے کہ آپ نبی مقرر ہوئے۔ اس کے کام میں خلل نہیں ہو سکتا۔
قرآن مجید اس ثبوت کو مع ایک اور ثبوت کے اس طرح بیان فرماتا ہے:۔

لاکن اللہ یشھد بما انزل الیک انزلہ بعلمہ و الملائکۃ یشھدون و کفی باللہ شھیدا	لیکن اللہ شاہد ہے اس کا کہ جو تیرے اوپر نازل ہوا وہ اس کے علم سے (نازل ہوا) اور ملائکہ شہادت دیتے ہیں اور اللہ کافی ہے شہادت کے لئے۔

یہ امر ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کس طرح نبی کے صدق نبوت کا شاہد ہے۔ یعنی وہ صحت وحی کا نگراں رہتا ہے۔ ملائکہ کی شہادت کی تفصیل یہ ہے کہ جب جبرئیل امین اول مرتبہ کسی نبی کے پاس وحی لے کر آتے ہیں تو ان کے ساتھ اور ملائکہ بھی ہوتے ہیں اور ان ملائکہ کے ساتھ نبی کو بعثت سے پہلے تحدیث (ہمکلامی) ہوتی رہی ہے وہ ان ملائکہ سے شناسا ہوتا ہے۔ پس وہ جبرئیل امین کے ساتھ آ کر یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ امین وحی ہیں اور خدا کے حکم سے آپ

بیان اس طرح ہے۔

افتمارونہ علی مایری	تو کیا تم شبہ کرتے ہو اس میں جو اس (نبی ﷺ) نے دیکھا (یعنی وہ جبرئیل تھے یا کوئی اور)
ولقد راہ نزلۃ اُخری	حالانکہ وہ (نبیؐ) اس کو دیکھ چکا تھا ایک بار اور سدرۃ المنتہیٰ کے قریب
عند سدرۃ المنتہی عندھا	کہ جس کے نزدیک جنت الماویٰ ہے
جنۃ الماوی اذیغشی	جبکہ چھا یا ہوا تھا سدرہ پہ جو چھایا رہتا ہے (جبرئیل کا جسم منور بالذات ہے اس کی شعاعیں سدرہ پر چھائی رہتی ہیں۔
السدرۃ مایغشی مازاغ	نہ اس (نبیؐ) کی نگاہ پھری
البصر وماطغی لقدرای	اور نہ خیرہ ہوئی۔ اور دیکھیں اس نے
من ایات ربہ الکبری	اپنے رب کی عظیم نشانیاں

توضیح آیات

اس شبہ کا رد کہ نبیؐ نے ممکن ہے جبرئیل کے پہچاننے میں غلطی کی ہو ممکن ہے کہ ان کو کوئی اور مخلوق نظر آیا ہو اس طرح فرمایا ہے کہ نبیؐ جبرئیل عا کو ایک بار پہلے دیکھ چکے تھے۔ ان کی معرفت یہ ہے کہ ان کا جسم منور بالذات ہے جس کے شعاعیں درخت سدرہ سے جو ان کے مقام کے پاس ہے منعکس ہوتی ہیں اور وہ بھی اس قدر تیز ہیں کہ انسان کی نگاہ خیرگی کرے لیکن نبیؐ نے جبرئیلؑ کو بخوبی دیکھا اور پہچان لیا۔ نہ ان کی نگاہ پھری نہ آنکھ چکا چوند ہوئی۔ نبیؐ نے اپنے رب کی عظیم نشانیاں دیکھیں۔ یہاں تین آیات کبریٰ کا ذکر ہے۔

وجہ استدلال

مذکورہ بالا آیت میں خداوند عالم فرماتا ہے کہ ملائیکہ نے توثیق رسالت جبرئیل کے بارہ میں نبی کے سامنے شہادت دی۔ لہذا ان کا بیان بحیثیت شہادت کے درست اور موثر ہوا۔ کیونکہ اگر وہ شہادت نبی کے لئے موجب یقین نہ ہوتی تو وہ شہادت دیتا بیکار ہے اور اس کا قرآن میں ذکر عبث۔

یہاں یہ صورت ہے کہ ایک روحانی اگر کہتا ہے کہ میں اللہ کی طرف سے وحی لے کر آیا ہوں اور دیگر ملائکہ اس کی شہادت دیتے ہیں اگر نبی کے لئے یہ سب کے سب اجنبی ہوں تو یہ احتمال قائم رہتا ہے کہ یہ اجنبی مخلوق دھوکا دے رہے ہیں۔ اس صورت میں ملائیکہ کی شہادت عبث ہوگی اور وہ شہادت شہادت نہ ہوگی۔ لیکن قرآن مجید اس کا حقیقی شہادت ہونا بیان فرماتا ہے (سورۂ نساء) لہذا لازم آیا کہ شاہد ملائکہ سے نبی واقف ہو اور ان کا صادق ہونا جانتا ہے۔ لہذا ثابت ہے کہ نبی ان ملائکہ سے قبل بعثت سے شناسا ہے۔

لہذا اسی آیت سے یہ ثابت ہے کہ نبی کو قبل بعثت تحدیث بالملائکہ ہوتی ہے۔

تیسری دلیل

ہمارے نبیؐ کے لئے ایک اور دلیل بھی تھی جو اور انبیاء کے لئے ثابت نہیں وہ یہ کہ آنحضرتؐ کو قبل بعثت معراج ہوئی اور وہاں جبرئیل سے ملاقات ہوئی۔ لہذا جب وہ وحی لے کر آئے تو چونکہ ان کا امین وحی ہونا آنحضرتؐ کو معلوم تھا آپ کو اپنی نبوت کا یقین ہوا۔ قرآن مجید میں اس کا

سوم یہ کہ ایسے مخلوق کا انسانوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا کرنا یا الہام کرنا یعنی اپنے خیالات کا ہمارے ذہن میں منتقل کرنا۔ ثابت نہیں۔ ان شبہات کا رد ہم ابھی بیان کریں گے۔ لیکن سب سے پہلے آخری شبہ سے بحث کریں گے۔

انتقال خیال

یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچا ہے۔ کہ ایک شخص اپنا خیال یا تصور دوسرے کے ذہن میں محض اپنی قوت ارادی سے پہونچا سکتا ہے۔ درحالیکہ دوسرا شخص اس کی نظر سے غائب ہو۔ اس طریقہ کا نام انتقال خیال یا Thought Transference ہے

اس کی کیفیت اور تحقیق کا اجمالی حال یہ ہے

برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں ایک جماعت مسمی بہ......

Society for Psychical Research

انیسوی صدی کے آخر میں قائم ہوئی۔ تفصیل کے لئے Encyclopaedia Britannica کا آرٹیکل Psychical Research ملاحظہ ہو۔ سوسائٹی کا مقصد یہ ہے کہ ان امور عجیبہ اور مشاہدات غریبہ کی تحقیق کرے جو ہر زمانہ اور ہر ملک کے عوام میں مشہور ہیں۔ مثلاً

۱۔ انسانوں پر روحوں کا آنا
۲ گھروں پر جنون کا قبضہ ہونا
۳۔ چیزوں کا خود بخود حرکت کرنا
۴۔ اینٹ پتھر کی ایسی بارش جن کا پھینکنے والا کوئی مشہود نہ ہو

ایک جنت الماویٰ یعنی وہ باغ جس میں وہ تمام نعمات موجود ہیں اور اسی کیفیت پر ہیں جو طاعت الٰہی کرنے والوں کے لئے آخرت میں موجود ہیں۔ پس آنحضرتؐ نے ان نعمات کا مشاہدہ کیا محلات وقصور۔ حوران بہشتی وہاں کا عالم سرور و فرحت۔ درخت و پھل تخت و مسندیں وغیرہ اس طرح آپ کا یقین انعام آخرت کے بارہ میں راسخ تر ہوا۔ دوسری آیت۔ جبرئیل امین جو اطاعت الٰہی کے لئے بندوں تک اس کے احکام پہونچانے والے ہیں اور عظیم قوت وبصیرت کے صاحب ہیں تیسری آیت۔ درخت سدرہ ہے کہ وہ اپنی عظمت اور روشنی سے مقام جبرئیل اور حوالی عرش کا نشان راہ ہے۔

نوٹ:۔ دوسری معراج جو بعد بعثت ہوئی اس کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں ہے اور اس میں آنحضرتؐ کے محاذ عرش تک پہونچنے کا ذکر ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقام جبرئیل کسی ایسے کرۂ فلکی پر ہے جو زمین کی مانند منجمد ہے کہ اس پر درخت سدرہ ہے اور ایک عظیم الشان باغ مع محلات وقصور کے واقع ہے۔

ضمیمہ دفعہ ۳

اس محل پر مخالفین مذہب کی طرف سے تین شہادت وارد ہوتے ہیں اول یہ کہ ایسی مخلوقات کا وجود مشاہدہ سے ثابت نہیں جو دکھائی بھی نہ دیں اور اس کے ساتھ ان کے جسم منجمد بھی ہوں جیسے ملک و جن دوم یہ کہ اگر ایسی مخلوق موجود بھی ہو تو ان کا صرف نبی کو نظر آنا اور کسی کو دکھائی نہ دینا بعید از قیاس ہے۔

میں سے ہے۔ دوسرے شخص سے کہا گیا کہ جو شے تمہارے خیال میں آئے اس کی تصویر کاغذ پر بناؤ۔ پہلے شخص نے بھی اسی وقت ایک شے کی تصویر بنائی اور اس کے تصوّر کو دوسرے کے ذہن میں منتقل کیا۔ نتیجہ میں دیکھا گیا کہ دونوں نے خرگوش کا خاکہ کھینچا تھا۔

دوسری مثال۔ ایک شخص نے دوسرے سے کہا تم کسی پھول کا نام دل میں لے لو اس کے ساتھ گلاب کا تصوّر اس کے ذہن میں منتقل کیا۔ اس کے بعد بتا دیا کہ تم نے گلاب کا نام دل میں لیا تھا۔ اور یہ صحیح تھا۔ اس قسم کے مشاہدات کی بنا پر یہ سوسائٹی اس نتیجہ پر پہونچی کہ "ایک شخص دوسرے کے ذہن میں اپنا خیال بلا کسی ظاہری یا طبیعی واسطہ کے پہونچا سکتا ہے"

پس الہام کی حقیقت یہی انتقال خیال ہے کہ جبریل معصوم کے ذہن میں اپنا خیال یا تصوّر منتقل کر دیتے ہیں۔ معمولاً جب ایک مشاق دوسرے کے ذہن میں اپنا تصور پہونچا دے تو یہ بھی انتقال خیال ہے۔
شیاطین جنّی، جب کوئی تصور انسان کے ذہن میں پہونچا دیں تو وہ وسوسہ ہے۔

انتقال خیال کے لئے دو شرطیں لازم ہیں۔
ایک یہ کہ اول شخص کو دوسرے کا تصور حاصل ہو۔ اس کو دیکھا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ خیال یا تصور جو منتقل کیا جائے پہلے سے دوسرے کو حاصل ہو چکا ہو۔ یعنی اسی شے کا خیال منتقل ہو سکتا ہے جس کا تصور دوسرے کو پہلے سے حاصل ہو چکا ہے۔
اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ایسے انتقال میں محض تصور حاصل ہوتا ہے۔ اس کے متعلق کوئی یقین حاصل نہیں ہوتا۔ پس علم یقینی کسی شے کا الہام سے حاصل نہیں ہوتا محض ایک تصور ذہن میں آجاتا ہے۔

۵۔ انتقال خیال

۶۔ جسموں کا ہلکا پڑجانا اور ذرہ سے سہارے سے بلند ہوجانا۔

۷۔ بلور کے ٹکڑے کو غور سے دیکھنا اور اس میں شکلیں نظر آنا وغیرہ وغیرہ

سوسائٹی نے سب کمیٹیاں بنائیں اور ان پر یہ موضوعات تحقیق کے لئے تقسیم کر دئے۔

یورپ کے معروف اصحاب علم اور ارباب سائنس اس کے ممبر ہوئے اگر سائنس دانوں میں Sir Oliver Lodge ایسے ممبر تو دوسری طرف دہریوں میں برطانیہ کے نامور وزیر اعظم Gladstone ایسے اس میں شریک تھے۔

اس سوسائٹی نے تحقیق کے وہ قواعد و ضوابط مقرر کئے جن پر سائنس کی تحقیق ہوتی ہے۔

چنانچہ ان لوگوں نے تحقیق شروع کی اور ہر ایسے شہر اور ملک میں گئے جہاں ایسے واقعات ہونے کی اطلاع ملی۔ وہاں پہونچ کر ایسے اشخاص اور مقامات کو دیکھا جہاں ایسے امور کا مشاہدہ ہونے کی خبر تھی ان اشخاص کے باضابطہ بیان لئے۔ ان پر جرح کی گئی۔ تائیدی شہادت ضبط کی۔ ان کی ثقاہت اور عادات کی تحقیق کی گئی۔ ان کی دماغی کیفیت کا تفحص کیا۔ شراب نوشی اور مسکرات کا استعمال نوٹ کیا گیا تحقیقات کے نتائج سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوتے رہتے ہیں حاصل ان کی تحقیق کا یہ ہے کہ دیگر امور کی حقیقت ابھی تک ثابت نہیں لیکن انتقال خیال کا واقعی ہونا ثابت ہوا۔ جس قسم کے مشاہدات سے اس کی واقعیت ثابت ہوئی ان کی مثال یہ ہے۔

دو شخصوں کو جدا جدا دور دو کمروں میں بٹھادیا۔ ایک وہ شخص ہے جس کو انتقال خیال کی مشق ہے۔ دوسرا شخص تحقیق کرنے والا

بعض لوگوں نے جہالت سے یہ کہا ہے کہ خدا وند عالم بندہ کے ذہن میں علم خلق کر دیتا ہے۔ لیکن یہ محال ہے کسی شئے کا علم حاصل کرنا کہ وہ یقینی ہے یا ظنی ہمارے نفس کا کام ہے۔ نفس جب شواہد پر نظر کرتا ہے تو اس کو یقین یا ظن حاصل ہوتا ہے اگر نفس کی فعلیت شہود عامل نہ ہو تو وہ تصور محض رہے گا اس کی حقیقت کی اثبات و نفی نہ ہوگی۔
اور یہ ظاہر ہے کہ خدا وند عالم ہمارا فعل خلق نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ فعل ہمارا نہ ہوگا۔ مثلاً ہمارے ہاتھ کو ارادہ باری سے حرکت تو ہو سکتی ہے لیکن وہ ہمارا ہاتھ ہلانا نہ ہوگا۔
اسی طرح جب ہمارا علم و یقین ہمارے نفس کی فعلیت سے حاصل ہوتا تو اس کو خدا خلق نہیں کر سکتا۔

دفعہ۴ نزول وحی کی کیفیت

۱۔ جبرئیل امین اس کلام کو جو انھیں کسی معصوم تک پہونچانا ہے لوح محفوظ سے اخذ کر کے معصوم کے پاس جاتے ہیں
۲۔ اور قریب سے اس کو سناتے ہیں۔
۳۔ معصوم اس کلام کو سن کر دہراتا ہے۔ جبرئیل امین مطمئن ہو جاتے ہیں کہ معصوم کے ذہن تک وہ کلام صحیح صحیح پہونچ گیا۔ یہ طریقۂ وحی بالرسالت کہا جاتا ہے۔
۴۔ کلام الٰہی لوح محفوظ سے بصورت نقش تحریر بھی ظاہر ہوتا ہے اور اس کا تلفظ بھی سنائی دیتا ہے۔ ان دو صورتوں سے کلام اس لیے ظاہر ہوتا ہے کہ جبرئیل امین کو غلط فہمی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید کا لوح محفوظ سے نمودار ہونا۔ اس کے تلفظ اور تحریر کا وجود ذیل کی آیات میں مذکور ہے۔

انتقال خیال کے لئے دو شخصوں کا روبرو ہونا یا قریب ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہاں اول شخص کے ذہن میں دوسرے کی تصویر ذہنی ہونا ضروری ہے۔ پس ایک نفس دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر انتقال خیال کر سکتا ہے۔ یہاں سے ظاہر ہے کہ جبرئیل امین کو الہام کرنے میں موردِ الہام کے پاس آنا ضروری نہیں۔

براہ راست باری تعالیٰ کی طرف سے الہام نہیں ہو سکتا

علم باری ازلی ہے۔ اس کا علم ہمہ گیر ہے۔ اشیاء کی حقیقت اور صفات کا احاطہ کرتا ہے۔ انسان کا علم جزی ہے حقیقت اور صفات کا احاطہ نہیں کرتا۔ پس جس ہیئت سے اشیاء علم باری میں منکشف ہیں اس صورت سے ان کا علم مخلوق کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مخلوق میں اس نوع علم کی صلاحیت نہیں ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست الہام ہونا محال ہے کیونکہ الہام میں اپنے علم یا تصور کو دوسرے کے ذہن میں منتقل کر دینا ہے۔ لیکن مخلوق اس کی صالح نہیں کہ وہ عالم مطلق کے علم کو ہو بہو وصول ذہن کر سکے۔

اس لئے خداوند عالم جس خیال یا تصور کا الہام بندہ کو کرنا چاہتا ہے وہ اپنے ارادہ اور قدرت سے لوح محفوظ پر بصورتِ کلام پیدا کر دیتا ہے اور جبرئیل امین اس کو اپنے ذہن میں لے کر بندہ کے ذہن میں منتقل کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کا کلام گہوارہ میں الہامی تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں وارد ہوا وایدناہ بروح القدس۔ اور ہم نے مدد کی اس (عیسیٰؑ) کی بذریعہ روح القدس کے۔

سب غلطیاں کی ہیں جن کا ذکر ہم نے اس کتاب کے تعارف میں کیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

مفسرین کی تعبیر

وکذالك اوحینا الیك — اور ہم نے وحی کی تیری طرف قرآن کی
روحامن امرنا — اپنے حکم سے درحالیکہ تو نہیں جانتا
ماکنت تدری ماالکتاب ولا الایمان — تھا کہ کتاب وایمان کیا ہے

صحیح تفسیر۔ تو اس طرح ہم نے اشارہ کیا تیری طرف ایک روحانی کو اپنے امر کے بارہ میں تو نہ جانتا تھا کہ حکم یا ایمان کیا ہے)

اس تعبیر میں جو لغزشیں ان لوگوں نے کی ہیں وہ آئینۂ عبرت ہیں

پہلی غلطی۔ لفظ روح کے معنی زبردستی قرآن بتائے ہیں حالانکہ عربی زبان میں کبھی اس لفظ کے یہ معنی نہ تھے۔ اور جس زمانہ میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا۔ روح بمعنی قرآن محاورہ عرب میں نہیں ہو سکتا تھا اس لئے کہ خود قرآن ہی موجود نہ تھا۔ اور قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ محاورہ عرب کے مطابق نازل ہوا۔ پس لفظ روح کے یہ نئے معنی اپنی طبیعت سے گڑھ لئے۔ قرآن ان معنی سے لفظوں کو استعمال کرتا ہے جو نبیؐ کے وقت میں رائج تھے

دوسری غلطی۔ اوحینا الیک من امرنا کی تعبیر کی " ہم نے وحی کی تیرے طرف اپنے حکم سے" حالانکہ کسی فاعل مختار کا یہ کہنا کہ میں بازار گیا اپنے حکم سے۔ یا کھانا کھایا اپنے حکم سے بالکل لایعنی اور لاطائل کلام ہے۔ خصوصاً خداوند عالم کا ایسا فرمانا درحالیکہ اس کے لئے کسی اور کے حکم سے کام کرنے کا احتمال نہیں کس قدر لغو بات ہے۔

تیسری غلطی۔ ماکنت تدری ماالکتاب الخ کو جملہ حالیہ قرار دیا اور یہ نہ دیکھا کہ اس کی ابتدا میں "و" حالیہ نہیں ہے۔

چوتھی غلطی۔ ان غلطیوں کی بنا پر آیت کے یہ معنی ہوئے کہ جب ہم نے

البروج:۔ بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ ۔ | بیشک وہ ذی شان قرآن ہے لوح محفوظ میں۔

واقعہ:۔ انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون۔ | بیشک وہ قرآن کریم ہے چھپی ہوئی کتاب میں۔

کتاب میں ہونا بیان ہے اس کے مکتوب ہونے کا۔

زخرف:۔ انا جعلنٰہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون | ہم نے اس کو بنایا عربی قراءت تاکہ تم عقل سے سمجھو۔

وانہ فی ام الکتاب لدنیا لعلی حکیم ۔ | اور وہ ہمارے پاس ام الکتاب میں ہے کہ ہم علی اور حکیم ہیں۔

اس آیت میں قرآن کا بصورت قراءت لوح محفوظ سے ظاہر ہونا مذکور ہے۔ اس کی تائید میں یہ آیت ہے۔

شعرا۔ ما تنزلت بہ الشیاطین و ماینبغی لہم وما یستطیعون انہم عن السمع لمعزولون ۔ | شیاطین اس کو لے کر نازل نہیں ہوئی وہ ان کے شایان حال نہیں اور نہ وہ اس پر قادر ہیں۔ وہ اس کے سننے سے جدا رکھے گئے ہیں۔

یہاں جنوں کے لئے لوح محفوظ سے قرآن کا سننا ناممکن بنایا ہے جس سے ثابت ہوا کہ لوح سے قرآن کے تلفظ کی آواز پیدا ہوتی ہے

ناظرین غور سے دیکھیں کہ اس مقام تک ہم نے بہت سے آیات کے مطالب بیان کئے۔ ان سے قرآن مجید کی اعلی معنویت اور بلندی عیاں ہے اس کے خلاف مفسرین اسلام نے ان آیات کی جو کچھ تعبیر کی ہے اس کو دیکھئے کہ کس طرح انہوں نے ان آیات کو لااصل بنایا ہے۔ منجملہ ان آیات کے ہم ایک آیت کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں کیونکہ اس کی تعبیر میں انہوں نے وہ

میں ہے تو وہ ایسا کلام ہے جیسا کتاب میں لکھا جاتا ہے نہ ایسا جو مکالمہ میں بولا جاتا ہے جس میں متکلم اپنے اشارہ اور لہجہ سے بہت کچھ مطلب ادا کر جاتا ہے اور الفاظ کو ساقط کر دیتا ہے لیکن کتاب میں اس طرح کے حذف نہیں ہو سکتے۔

یہاں سے اس شبہ کا رد حاصل ہے کہ شاید جبرئیل امین نے نبیؐ کو قرآن سناتے وقت اپنے لہجہ اور اشارہ سے وہ مطالب ادا کر دیئے ہوں جو عبارت قرآن سے ظاہر نہیں ہیں۔ اس صورت میں نبیؐ ہی قرآن کا صحیح مطلب بیان کر سکتے تھے۔

اس کا رد اس آیت سے ہوا۔ علاوہ اس کے ایک رد اور ہے اور یہ کہ قرآن مجید نے بکثرت یا ایہا الذین آمنوا اور یا ایہا الناس کے ساتھ عام مسلمانوں اور کفار سے خطاب کیا ہے۔ پس اگر قرآن مجید کو صرف نبیؐ ہی سمجھ سکتے تھے تو نبیؐ کے ساتھ اوروں کو خطاب کرنا درست نہ ہوتا۔

قرآن مجید جنوں کے وسیلہ سے نبیؐ کو نہیں پہونچا

کفار عرب نے ایک یہ شبہ پیش کیا تھا کہ قرآن مجید کلام آسمانی ہے لیکن یہ کلام جنوں نے لاکر محمد صلعم کو دیدیا ہے۔ وہ در حقیقت نبی نہیں ہیں۔

اس کے جواب میں قرآن اس طرح ناطق ہے۔

ما تنزلت بہ الشیاطین و	شیاطین نے اس کو نازل نہیں کیا وہ ان
ما ینبغی لہ وما یستطیعون	کے شایان نہیں اور نہ ایسا کر سکتے ہیں
انہم عن السمع لمعزولون۔	وہ اسکے سننے سے جدا رکھے گئے ہیں۔

وحی کی تیری طرف تو اے نبیؐ تو یہ بھی نہ جانتا تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہے۔ اس لئے ان علماء نے یہ اعتقاد قائم کیا کہ تقریباً چالیس سال کی عمر میں جب نبیؐ پر وحی شروع ہوئے تو آپ (معاذاللہ) اس قدر جاہل اور کم فہم تھے کہ کتاب اور ایمان کے معنی بھی نہ سمجھتے تھے۔

مفسرین کی ایک دوسری جماعت اس اعتراض سے بچنے کے لیے اس طرح تعبیر کرتی ہے کہ "اے نبی تو تفصیل کتاب اور ایمان نہ جانتا تھا" ماکنت تدری ما تفصیل الکتاب ولا الایمان نہ بایا بلکہ ایسا ناقص الدلالت کلام بھیجا کہ ان علما کو اصلاح دینا پڑی۔

نوٹ۔ چونکہ ہم نے مفسرین اسلام کی غلطیوں کو اجمالاً تعارف میں بیان کیا ہے لہذا ثبوت میں یہ مثال ہے اور ایسے اور مثالیں جا بجا پیش کرتے جائیں گے۔

قرآن مجید کا دو طرح لوح سے ظاہر ہونا اور اس کی مصلحت

زخرف :- اناجعلنٰہ قرانا عربیا لعلکم تعقلون۔ وانہ فی ام الکتاب لدنیا لعلی حکیم۔	ہم نے بنایا اس (قرآن) کو عربی قرأت (کلام صوتی) تاکہ تم عقل سے سمجھو اور وہ ہے ام الکتاب میں ہمارے پاس کہ ہم علی اور حکیم ہیں

قرانا عربیا سے مراد صوتی کلام۔

ام الکتب میں ہونے سے مراد کلام مکتوب ہونا

علی یا بلند مرتبہ ہونے سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہمارا علم اس سے ارفع ہے کہ مخلوق اس کی حامل ہو سکے۔

حکیم سے اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ جب قرآن مفردہ اور مکتوب

سنگباری سے اذیت پانا ثابت ہو۔ ورنہ یہ دلیل غیر مستدل ہے

جواب

جن لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے ان کے نزدیک جنوں کا موجود ہونا بھی مسلم ہے اور وہ ان کو قابلِ ہلاکت و ضرر بھی مانتے ہیں۔ اس لئے یہ دلیل ان پر حجت ہے۔ باعتبار حقیقت قرآن مجید کے بیان سے جنوں کا وجود اور ان کا قابلِ ایذا ہونا آشکارہ ہے۔ انسان کی طرح جن مکلف ہیں ان میں مومن و کافر ہیں اس لئے وہ مستوجب ثواب و عذاب ہیں اس لئے وہ بالضرورت ایسے خلقت پر ہیں کہ ان کو عذاب ہو سکے اور قابلیت ایذا کو نار و ضرب سے ایذا پہونچنا ضروری ہے اس لئے کہ عذاب کی یہی دو صورتیں ہیں۔

شہاب ثاقب کے متعلق اس قدر علم تو قدیم سے تھا کہ جب وہ زمین کی سطح تک پہونچا تو دیکھا کہ وہ از قبیل معدن ہے یا تنجیر کا ایک ٹکڑا ہے جدید سائنس میں ان کے متعلق مزید تحقیق ہے جس کو ہم ابھی بیان کریں گے۔

اس آیت قرآن سے ثابت ہے کہ یہ سنگباری جو آسمان کی طرف جاتے میں جنوں پر ہوتی ہے ملائکہ کے ہاتھوں نہیں ہے جیسا کہ بعض علماء نے تجویز کر لیا ہے۔ اس کے خلاف آیت میں اس طرح اشارہ ہے کہ جب کوئی یکایک جھپٹ کر آسمان کی طرف اوپر جا نکلے تو شہاب ثاقب اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اُن کے مفروضہ کے مطابق اگر ملائکہ خدا کی طرف سے مقرر ہیں کہ جنوں کو سنگباری سے آسمان کی طرف نہ چڑھنے دیں۔ تو ان کا باوجود ان محافظوں کے جا نکلنا یا تو ملائکہ کی غفلت سے ہے یا جداتے ان کی کافی تعداد حفاظت کے

وما ینبغی لہ کی مراد یہ ہے کہ قرآن مجید تعلیم معرفت اور تقویٰ ہے اور شیاطین کا مقصد انسانوں کو ضلالت اور بدکاری کی طرف لے جانا ہے۔ لہذا وہ اپنے مقصد کے منافی کام کیوں کریں گے۔ (جنوں میں جو کافر ہیں وہ شیاطین کہلاتے ہیں) اور مومن جن ایسا فریب نہ کریں گے۔

دوسرا جواب وما یستطیعون ہے۔ مراد یہ ہے کہ جنوں کے لئے زمین کو چھوڑ کر عالم بالا کی طرف جانا ممکن نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ شہاب ثاقب کی بارش اس کثرت سے زمین پر ہوتی رہتی ہے کہ اگر وہ اوپر جائیں تو آن سے ہلاک ہوجائیں۔ اس جواب کی شرح ذیل کی آیات میں ہے۔

۱۔ الصافات

لا یسمعون الی الملاء الاعلیٰ	جب بھی وہ عالم بالا کی طرف سننے
ویقذفون من کل جانب	کو جانا چاہتے ہیں
دحورا ولھم عذاب واصب	تو ہر طرف سے سنگباری ان کو
الامن خطف الخطفۃ	کھدیڑ دیتی ہے۔
فاتبعہ شہاب ثاقب	اور ان کو شدید ایذا و ذلت ہوتی ہے اگر کوئی یکایک جا نکلے تو شہاب ثاقب اس کا پیچھا کرتے ہیں۔

اس لئے یہ ممکن نہیں کہ عالم بالا کی طرف جا سکیں اور لوح محفوظ سے کلام الٰہی سن سکیں۔

ایک شبہ :۔

یہ دلیل کہ شہاب ثاقب اور سنگباری جنوں کو آسمان پر جانے سے مانع ہے اس صورت میں قطع پیدا کرے گی جب مخاطب پر جنوں کا

والے تاروں کی ہے تو فضا میں کس قدر کثیر تعداد ہوگی) یہ ستارے ستر میل تک تیزی سے آتے ہیں اس کے بعد خلا میں منتشر ہو جاتے ہیں اور زمین پر صرف خاک کی صورت میں آتے ہیں۔

یہ شہاب ثاقب کہاں سے آئے؟

ارباب سائنس کا گمان ہے کہ چونکہ آتش فشاں پہاڑ مادۂ ارضیہ کو بڑے زور سے پھینکتا ہے۔ اور علم الحرکت میں ثابت ہے کہ کوئی جسم ۵ میل فی سکنڈ کی رفتار سے اوپر پھینکا جائے وہ زمین کو واپس نہ آئے گا بلکہ کشش ارض کے احاطہ سے اس قدر باہر نکل جائے گا کہ وہ واپس نہ لا سکے گی اور وہ آفتاب کے گرد دورہ کرنے لگے گا۔

پس شہاب ثاقب وہ پتھر ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں سے نکل کر فضا میں چکر لگا رہے ہیں۔

حوالہ کے لئے دیکھیے آرٹیکل علم الجو Meteorology Encyclopaedia Britannica

ذیل کی آیات میں بیان ہوا ہے کہ جبرئیلؑ لوح سے وحی اخذ کرکے نیچے زمین پر آتے ہیں اور رسولؐ کے قریب پہونچ کر دو کمان کے فاصلہ سے اور کبھی اس سے کم سے وحی سناتے ہیں کل وحی اسی طرح ہوئی ہے۔

عالم بالا سے مراد صرف اوپر کا عالم نہیں ہے بلکہ جو کچھ ماوراء الارض ہے وہ عالم بالا ہے۔

النجم۔ والنجم اذا هوى ما ضل	تاہر یا دلیل ہے تارہ جب وہ ٹوٹے
صاحبکم وما غوى وما ینطق	کہ تمہارا صاحب (یعنی نبیؐ) نہ بہکا یا ہوا
عن الهوى ان هو الا وحی	ہے نہ خود گمراہی اختیار کی ہے۔
یوحیٰ علمه شدید القوى	وہ اقتضاء ہوا و ہوس سے کلام نہیں

لئے مقرر نہیں کی ہے۔ لیکن یہ دونوں شقیں باطل ہیں۔ اول اس لئے کہ ملائکہ معصوم ہیں ان سے غفلت نہیں ہو سکتی۔ دوم اس لئے کہ حکیم مطلق کی طرف سے ناقص اہتمام و انتظام ہونا محال ہے۔

جدید تحقیق نے اس مسئلہ کو پورے طور پر واضح کر دیا ہے شہاب ثاقب پتھر اور معدنیات کے ٹکڑے جو فضا میں آفتاب کے گرد مثل زمین کے چکر لگا رہے ہیں۔ زمین اپنی گردش دوری میں جب ان کے قریب آجاتی ہے تو ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور وہ بڑی سرعت سے کرۂ ہوا میں داخل ہوتے ہیں۔ سرعت رفتار کے سبب ہوا سے رگڑ کھا کر وہ گرم و مشتعل ہوتے ہیں اکثر جل جاتے ہیں جو شہاب ثاقب کہلاتے ہیں۔ بعض گرمی سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ بعض سطح زمین تک پہونچتے ہیں۔ انھیں کو قرآن میں سنگباری سے تعبیر فرمایا ہے

شہاب ثاقب کی رفتار ۴۵ میل فی سکنڈ تک مشاہدہ ہوئی ہے اس عظیم رفتار کے سبب وہ سماء میں زبردست آلہ ہلاکت ہیں۔ زمین تک پہونچ کر وہ اکثر کئی فٹ مٹی میں دھنس جاتے ہیں سب سے بڑا شہاب ثاقب جو اب تک پایا گیا ہے وہ کالیفورنیا میں ایک جلے پتھر کا ٹکڑا ہے جو وزن میں کئی ٹن ہے۔ اور ایک ٹن ۲۷ من سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔

کرۂ ہوا یعنی سماء دنیا ان شہاب ثاقب کو ان کے گزار میں اپنی رگڑ سے یکایک گرم کر کے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے اس طرح ساکنان ارض کی حفاظت کرتا ہے منجملہ دیگر وجوہ کے ایک یہ بھی ہے کہ سماء کو قرآن مجید میں سقف فرمایا ہے۔ ایک برطانوی سائنسداں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ہر چوبیس گھنٹہ میں تقریباً دو کروڑ ستارے ٹوٹتے ہیں (جب یہ تعداد روزانہ ٹوٹنے

وہ شبہ یہ ہے کہ جب کوئی دور سے کلام سناتا ہے یا بات کرتا ہے تو مخاطب کو کوئی لفظ سنائی دیتا ہے اور کوئی لفظ سنائی نہیں دیتا۔ لیکن مخاطب کلام کے سوق یا رخ سے نہ سنے ہوئے الفاظ اپنے ذہن سے لگا لیتا ہے اور بعدہ یہی سمجھتا ہے کہ متکلم نے یہ سب الفاظ کہے۔ پس اگر جبرئیل کا پاس سے کلام سنانا مذکور نہ ہو تو یہ احتمال قائم ہو جاتا ہے کہ ممکن ہے جبرئیلؑ نے قرآن دور سے نبیؐ کو سنایا ہو۔ اس صورت پر قرآن میں کلام خدا اور الفاظ نبیؐ کا خلط ہو گا۔ اور قرآن مجید پورے طور پر کلام خدا نہ ہو گا۔ اور نہ واجب التعمیل۔ پس انہدام شریعت ہو جائے گا اس لئے قرآن مجید میں بالتصریح وارد ہوا کہ جبرئیلؑ نبیؐ سے کبھی دو کمان کے فاصلہ پر اور کبھی اس سے بھی کم (یعنی اس سے زیادہ کبھی نہیں) فاصلہ سے نبیؐ کو وحی سنایا کرتے تھے۔

سیاق و سباق پر نظر رکھئے تو عیاں ہے کہ ان آیات کے یہی معنی ہیں لیکن وہ مفسرین اسلام جو قرآن کو مسخ کرنے میں مشاق ہیں ان آیات کے درمیان سے ایک ٹکڑا لے کر عجیب مضحکہ خیز معنی پیدا کرتے ہیں

دنی فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی کا یہ ترجمہ کیا ہے

نزدیک آیا پھر قریب ہوا (یعنی نبیؐ اللہ کے قریب آیا) یہاں تک کہ اللہ اور نبی کے درمیان دو کمان یا اس سے کم فاصلہ رہ گیا	نزدیک آنا اور قریب ہونا ایک ہی بات ہے لہٰذا ایک جملہ حشو قبیح و تکرار عبث ہوا۔ کتنا فاصلہ رہا یہ اللہ کو بھی معلوم نہیں۔ اس لئے فرمایا ہے کہ دو کمان یا اس سے کم (معاذ اللہ)

یہ ترجمہ قواعد عربی کی رو سے غلط۔ یہ مفہوم عقلاً باطل بلکہ شرک سے بھی بدتر

ذو مرة - فاستوی وھو
بالافق الاعلیٰ ثم دنیٰ فتدلیٰ
فکان قاب قوسین او ادنیٰ
فاوحیٰ الی عبدہٖ ما اوحیٰ

سناتا - بلکہ وہ صرف وحی ہے جو کی
گئی ہے زبردست قوتوں والے
(جبرئیلؑ) نے اس کو پہونچایا ہے
جو ذی عقل ہے - پس جب وہ ارادہ
کرتا ہے (وحی لے جانے کا)
درحالیکہ وہ عالم بالا میں ہوتا
ہے تو نیچے آتا ہے اور قریب (نبیؐ)
آتا ہے یہاں تک کہ دو کمانوں یا
(کبھی) اس سے بھی کم فاصلہ پر ہوتا ہے
تو وہ وحی پہونچاتا ہے اس (معبود)
کے بندہ کو جو کچھ بھی وحی وہ پہونچاتا
ہے -

انه لقول رسول کریم
ذی قوة - عند ذی العرش
مکین -

وہ (قرآن) قول ہے ایک مکرم
سفیر کا (یعنی اس کی قرات سے نبیؐ
نے سنا) جو صاحب قوت ہے اور
مالکِ عرش کی بارگاہ میں مکرم -

توضیحات

جبرئیلؑ کو ان آیات میں ایک جگہ شدید القویٰ - ذو مرہ فرمایا اور دوسری جگہ ذی قوت - اور یہاں سے دفع دخل کیا ہے اس شبہ کا کہ جبرئیل کے حافظہ یا فہم نے کلام الٰہی کے سمجھنے یا یاد رکھنے میں غلطی کی ہو - اس لئے بتایا کہ جبرئیلؑ زبردست قوتوں والے ہیں - قوائے ذہنیہ کی شدت اور حدت کے علاوہ قوائے جسمانی کی یہ کیفیت کہ عرش سے ارض تک ایک آن میں پہونچتے ہیں -

اس شبہ کے علاوہ ان آیات میں ایک دقیق اور سخت شبہ کا دفع دخل ہے

لہذا یہ کلام اللہ ہے اور بذریعہ وحی نبیؐ کو پہونچا ہے اور وحی پہونچانے کی یہ کیفیت ہے کہ جبرئیلؑ نبیؐ کے قریب آکر کلام اللہ پڑھ کر سناتے ہیں

مفسرین اسلام کی غلطیاں

ان آیات کی تعبیر میں مفسرین سے متعدد غلطیاں ہوئی ہیں اور ناظرین تعجب کریں گے کہ انہوں نے خود اپنے مسلمہ قواعد واصول سے انحراف کیا ہے۔

۱۔ سب جانتے ہیں کہ ضمیر بجائے اسم کے کلام میں اس لئے لاتے ہیں کہ بار بار اسم کی تکرار پیدا نہ ہو۔ ایک جگہ اسم لے آئے اور باقی جگہ ضمیر سے کام لیا۔ یہ اسم کا مرجع کہلاتا ہے۔ چنانچہ اصول تفسیر کے بیان میں علامہ سیوطی اتفاق جلد ۱ صفحہ ۱۸۸ پر اس طرح لکھتے ہیں

فی بیان ضمیر وعودہ	ضمیر اور اس کے مرجع کے بیان میں
مرجع الضمیر۔ لابد من	ضمیر کے لئے مرجع ہونا لابدی ہے
مرجع یعود الیہ	کہ جس کی طرف وہ ضمیر راجع ہو

اور یہ تشخیص کہ ضمیر کس اسم کی طرف راجع ہے اس قاعدہ سے کی جاتی ہے۔

قاعدہ۔ الاصل عودہ الی	قاعدہ کی اصل یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع
اقرب المذکور	وہ اسم ہے جو اس سے قریب تر مذکور ہو۔

تو اب ملاحظہ فرمائیے کہ سورۂ النجم کی مذکورہ بالا آیات میں صاحبکم پہلے آیا۔ اس کے بعد کلمہ شدید القوی (جبرئیلؑ) آیا تو اس کے بعد جس قدر ضمائر آئے ان سے قریب تر اسم مذکورہ شدید القوی ہے۔ اس لئے یہ سب ضمائر قاعدہ سے شدید القوی (جبرئیل) کی طرف راجع ہیں۔

پہلی کھلی غلطی ان لوگوں نے یہ کی کہ اس قاعدہ کو توڑ کر دی

ہے۔ اس لئے کہ صرف جسم جگہ میں ہوتا ہے اس لئے جو جگہ میں ہے وہ جسم ہے۔ فاصلہ صرف دو جسموں کے درمیان ہو سکتا ہے۔ اور ہر جسم مرکب ہے۔ اور ہر مرکب حادث ہے۔ لہذا لازم آیا کہ اللہ تعالیٰ جسم ہونے کے سبب حادث ہو اور اس لئے اس کا بھی کوئی خالق ہو۔ یہ شرک سے بھی بدتر ہے۔ شرک میں تو برابر کا شریک تجویز کیا جاتا ہے۔

آیات کی توضیح

جب نبیؐ نے کفار کو کلام اللہ پڑھ کر سنایا اور تبلیغ دین کی تو کفار نے کہا کہ آپ کو یا تو کسی جن نے بہکایا ہے یا ہوا و ہوس کے سبب یہ دعویٰ کیا ہے۔ ان آیات میں یہ تصریح ہے کہ یہ دونوں احتمال باطل ہیں جو کلام نبیؐ نے پڑھ کر سنایا وہ کلام خدا ہے بذریعہ جبرئیل نبیؐ کو وحی کیا گیا ہے۔

پس ما ینطق عن الھویٰ میں کلام کرنے سے کلام اللہ سنانا مراد ہے بعض مفسرین اسلام نے اس آیت کو سیاق و سباق سے جدا کر کے یہ معنی پیدا کئے کہ نبیؐ جو کلام بھی کرتے تھے وہ وحی سے کرتے تھے۔ مثلاً بیوی نے پوچھا آپ نے کھانا کھا لیا۔ تو اب پہلے وحی آئے گی پھر نبیؐ فرمائیں گے کہ ہاں کھا لیا۔ یا کسی صحابی نے پوچھا کہ آپ کو جو یا کھجور کی ضرورت ہو تو میں بازار سے لا دوں۔ اس پر پہلے وحی آئے گی پھر نبیؐ معقول جواب دیں گے۔ ورنہ خود نہ ان کو سمجھ ہے نہ عقل کہ بات سمجھ کر کر سکیں۔ (معاذ اللہ)

کفار نے یہ شبہ کہ جنوں نے عالم بالا سے یہ کلام لا دیا ہے اس بنا پر کیا کہ قرآن کی مثل کلام کا بشر کی طاقت سے باہر ہونا ان پر عیاں تھا۔ لہذا اس طرح رد واقع ہوا کہ جنوں کا عالم بالا کی طرف صعود کرنا ٹوٹنے والے ستاروں کے سبب ممکن نہیں۔ اور بشر اس کلام کی مثل پر قادر نہیں۔

فالاصول یئول ذالك　　　　پس اصولی تاویل سے ان کی صحیح مراد بیان کرنا ہے۔

اس قاعدہ کو اس طرح توڑا۔ جب دیکھا تھا کہ نبیؐ کے اللہ کے قریب لانے سے اور دو کمان کے فاصلہ پر ٹھہرانے سے باری تعالیٰ کی جسمیت لازم آتی ہے اور یہ بات اس کی ذات کے لئے جائز نہیں تو اپنی غلطی کا ادراک کرنا چاہیئے تھا۔

ان آیات میں قابل لحاظ امر یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی جبرئیلؑ پر افضلیت کا بیان ہے۔ وہ اس طرح کہ نبیؐ اکرمؐ کو جبرئیلؑ کے مواجہہ میں اپنا عبد فرمایا ہے (فاوحی الی عبدہ ما اوحی) اور جبرئیل کو اس تسمیہ سے محروم کرنا اس معنی پر دال ہے کہ جہاں عبودیت الٰہی کا ذکر ہے وہاں نبیؐ ہی کی عبودیت لائق ذکر ہے پس عبادت میں نبیؐ جبرئیلؑ سے افضل ہیں اور عبادت ہی بنائے فضیلت ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی جیسے کوئی بادشاہ اپنے متعدد خادموں کے مواجہہ ایک خادم کے لئے فرمائے کہ ہمارے خادم نے یہ کام کیا۔ اس محل پر یہ تخصیص ثابت کرتی ہے کہ وہ خدمت میں ممتاز اور مخصوص ہے۔

اس کے علاوہ نبیؐ کو یہ افضلیت اس وقت حاصل ہے جبکہ رسالت کی ابتدا ہے کیونکہ کل نزول وحی کا بیان ہے لہذا نبیؐ کو بعثت کے وقت ہی اپنی عبادت سے جبرئیل پر افضلیت حاصل ہو چکی تھی۔

لہذا ثابت ہوا کہ نبیؐ نے اکتساباً علم و معرفت حاصل کر لی تھی کیونکہ تحصیل علم و معرفت عبادت کا جزء ہے۔

فتدلی کے ضمائر کو بجائے شدید القوی کے صاحبکم کی طرف راجع کیا جو اسم بعید ہے۔ یعنی رسول اکرم قریب گئے۔ کس کے قریب گئے؟ زبردستی اپنی طرف سے لگا دیا کہ اللہ کے قریب گئے۔ یہ دوسری غلطی کی کہ اسم اللہ ان آیات میں کہیں مذکور نہیں۔ پھر یہ تیسری غلطی کی کہ فاوحی کی ضمیر کا مرجع اللہ کو قرار دیا جو کہیں مذکور نہیں۔ ضمیر کا مرجع کبھی متضمن ہوتا ہے جیسے اعدلوا ھو اقرب للتقوی

یہاں اعدلوا فعل سے اسم عدل حاصل ہو رہا ہے۔ اس کی طرف ضمیر "ہو" (وہ) راجع ہے۔

(دوسری مثال)

واذا حضر القسمۃ اولی القربی	اور جب تقسیم ہو تو اقربا اور یتیموں
والیتامی والمساکین فارزقوھم	اور مساکین کو اس میں سے روزی
منہ۔ الی مقسوم للدلالۃ	دو "اس میں سے" یعنی مقسوم
القسمۃ	میں سے جو القسمۃ کا مدلول ہے

اس قاعدہ کو توڑ کر پھر یہ غلطی کی کہ فاوحی الی عبدہ میں عبدہ کی ضمیر کا مرجع متضمن "معبود" ہے جو عبد سے لازم آتا ہے اس کی بجائے اپنی طرف سے لفظ الہ کو مرجع قرار دیا جو نہ مذکور ہے نہ متضمن۔

اس کے علاوہ تفسیر کے اس قاعدہ کو بھی توڑا جو اتقان میں بیان ہوا ہے۔

لتاسع:۔ اصول دین	نوین ۔ اصول دین
بما فی القرآن من آیات	اس واسطے کہ قرآن میں ایسے آیات
الد اللہ بظاھرھا علی مالا	ہیں جن کا ظاہر ایسے بات پر دلالت
یجوز علی اللہ تعالی	کرتا ہے جو اللہ تعالی کیلئے جائز نہیں ہے۔

افضل ہیں اس لئے ان کے لئے وصول وحی کی یہ کیفیت بدرجہ اولیٰ ثابت ہے۔ کہ انہوں نے معاً کلام اللہ کو پہچانا اور یہ ظاہر کرنے کو کہ ہم تیرے احکام کی تعمیل کریں گے سجدہ میں گرے۔ اور پھر یہ ظاہر کرنے کو کہ یہ اطاعت جاری رہے گی۔ دوبارہ سجدہ میں گرے۔ سجدہ اظہار اطاعت ہے۔

مفسرین متفق ہیں کہ نماز میں دو سجدہ کرنے کا حکم اسی آیت سے حاصل ہے۔ پس جن کی سنت کی صورت میں اس حکم کو قرآن نے پیش کیا ہے۔ یہ وہی حضرات ہیں جن کی سنت کو شریعت سورہ فاتحہ میں بتایا ہے۔ اهدنا صراط المستقیم میں صراط مستقیم شریعت محمدیؐ ہے اور اس کو صراط الذین انعمت علیہم فرمایا ہے۔ یعنی وہ سنت ہے ان کی جو انعام الٰہی کے مورد ہیں۔

یہاں سے ان واہی تباہی روایات کی حقیقت کھلتی ہے جن میں یہ بیان ہوا کہ جبرئیلؑ جب پہلے وحی لے کر آئے تو رسول اللہ (معاذ اللہ) ایسے خائف اور منتشر الحواس ہوئے کہ باربار فرمایا میں پڑھا نہیں ہوں حالانکہ جبرئیلؑ امین کلام اللہ کی قراءت کر رہے تھے۔ اس کے سمجھنے اور دہرانے کو پڑھا ہوا ہونا درکار نہ تھا۔

اس اعتراض سے بچنے کو ایک اور روایت گڑھی کہ جبرئیلؑ پارچہ حریر پر لکھا ہوا قرآن لائے تھے اور آنحضرتؐ سے کہا کہ پڑھئے۔ یہ روایات قرآن مجید کی تکذیب کرتی ہیں قرآن کہتا ہے کہ جو وحی بھی نبیؐ کو ہوئی وہ اسی طرح ہوئی کہ جبرئیلؑ نے دو کمان کے فاصلہ پر کھڑے ہو کر قرآن سنایا (فاوحی الی عبدہ ما اوحی) قرآن مجید پر عرض کرنے سے ان روایات کا وضعی ہونا ظاہر ہے۔

دفعہ ۸۔

وصول وحی کے وقت معصوم کی روش

بعثت سے پہلے ہی معصوم کو اصول دین کی معرفت حاصل ہوتی ہے چنانچہ وہ جانتا ہے کہ کتاب الہٰی کس وضع اور کیسے مطالب پر ہونا چاہئے لہذا جب اس پر کلام الہٰی نازل ہوتا ہے تو معصوم کے ادراک کی بلندی معاً اس کے کلام اللہ ہونے کا یقین بہم پہونچاتی ہے چنانچہ وہ احکام الہٰی شکر شدید خشوع وخضوع کے ساتھ سجدہ میں جاتا ہے اور اس طرح اپنے مطیع ومنقاد ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ اور ہیبت اور جلال الہٰی اس کو خوف ورجا سے بھر دیتا ہے۔ ذیل کی آیت میں معصومین کے علم کا نزول کتاب سے سابق ہونا (کیونکہ اکتساب معرفت عقلی ہے) اور ان کا ایسی عارفانہ وضع کے ساتھ وحی کو وصول کرنا مذکور ہے۔

بنی اسرائیل - ۱۱

قل آمنوا بہ او لا تومنوا	اے رسول کہدو (امت سے) کہ ایمان لاؤ یا نہ لاؤ۔
ان الذین اوتوا العلم من قبلہ اذا یتلیٰ علیھم یخرون للاذقان سجدا ویقولون سبحان ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا ویخرون للاذقان یبکون ویزیدھم خشوعا	بیشک جن کو پہلے سے علم دیا گیا ہے وہ جب ان کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے گرتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے بیشک اس کا وعدہ پورا ہونے والا تھا اور (پھر) گرتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے اور ان کا خشوع زیادہ ہوتا ہے

اس آیت میں متعدد نفوس کا ذکر ہے اور معصومین میں نبی ؐ سب سے

ہدایت الٰہی میسّر ہوئی اور وہ نبیؑ ہوئے

قرآن مجید میں نبی کی طرف سے کمی یا زیادتی نہ ہونا

اگرچہ معصوم سے خطا کا احتمال عقلاً مرفوع ہے۔ لیکن خداوند عالم مزید توثیق کے لئے فرماتا ہے کہ اگر کوئی نبی کلام خدا میں اپنی طرف سے تغیر کرے تو خداوند عالم اس کو ہلاک کر دے۔

ولو تقول علینا بعض الاقاویل	اور اگر وہ بعض باتیں وضع کر کے
لاخذنا منہ بالیمین ثم	ہماری طرف منسوب کرے تو دست راست
لقطعنا منہ الوتین	سے ہم اس کو پکڑیں اور اس کی رگ گردن کاٹ دیں۔

یہ آیت رسالت نبیؐ کی صحت پر شاہد ہے۔ بعینہ اسی مضمون کی آیت توریت میں وارد ہے۔

کتاب تثنیہ باب ۱۸ آیت ۲۰۔

لیکن جو نبی یہ جرأت کرے کہ میرے نام سے کوئی بات کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا۔ یا وہ (نبی) اور معبودوں کی طرف سے بات کہے تو وہ نبی ضرور ہلاک ہوگا۔

ان دونوں آیتوں کے مقابلہ سے ظاہر ہے کہ یہ بیان ہلاکت صرف انبیا کے لئے ہے۔ ان آیات میں یہ نہیں کہ اگر کوئی جھوٹا نبی بن کر خدا پر بہتان باندھے تو وہ بھی ہلاک ہوگا۔

نوٹ:۔ متکلمین اسلام کے سامنے یہ اعتراض آیا کہ نبی کو اپنی نبوت کا یقین کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اور جب خود اس کے لئے ایک بات یقینی نہیں تو وہ مخاطب سے اس کے یقین کا طالب کیسے ہو سکتا ہے (اعتراض کی

حاصل یہ کہ ابتداء سے وصول وحی کے وقت نبیؐ مطمئن اور قائم الحواس رہے اور رویت جبرئیل سے کوئی خوف وہراس آپ کو نہ ہوا۔ اس لئے آپ نے بالکل صحیح صحیح وحی کو وصول کیا۔ ان روایات مکذوبہ کی بنا پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب نبیؐ پر وصول وحی کے وقت خوف وہراس و انتشار حواس پیدا ہوتا تھا تو کیوں باور کریں کہ جو کچھ جبرئیلؑ نے سنایا وہ صحیح سنا اور یاد رکھا

ہر نبیؐ کو ایک ہی طریقہ پر وحی ہوئی

النساء ۱۷

انا اوحینا الیک کما اوحینا	ہم نے وحی کی تیری طرف اسی طرح
الی نوح والنبیین من	جس طرح وحی کی نوحؑ پر اور ان نبیوں
بعدہ	پر جو اس کے بعد ہوئے۔

تمام انبیاء پر وحی ہونے کا یہی طریقہ رہا جو آنحضرتؐ کے لئے بالتفصیل قرآن مجید سے اوپر بیان کیا جا چکا کہ توریت کی وحی بھی اسی طرح حضرت موسیٰؑ پر ہوئی۔ اور آن سے جو کلام من وراء الحجاب ہوا تھا وہ صرف ان کی بعثت کے وقت ہوا جس کی وجہ ہم نے تفصیل سے آگے حضرت موسیٰؑ کے احوال میں بیان کی ہے۔

یہاں یہ بھی بیان ہو کہ حضرت نوحؑ سے پہلے جو نبی ہوئے جیسے حضرت آدمؑ اور حضرت ادریسؑ ان پر وحی کا طریقہ مختلف تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ نوح سے پہلے عموماً انسان علم وفہم کے اس درجہ پر نہ پہونچے تھے کہ تحقیق دین کر سکیں۔ اس لئے وہ صرف تکلیف عقلیہ سے مکلف رہے ہاں خاص خاص افراد جو اپنی ذاتی ذکاوت سے بلند مرتبہ پر پہونچے ان کو

جبرئیلؑ نبیؐ کی قرات سنکر اطمینان کر لیتے تھے کہ نبیؐ کے ذہن تک وحی کو صحیح صحیح پہونچا دیا

بقرہ ۱۲

قل من کان عدوا لجبرئیل	کہدو اس سے جو جبرئیل کا دشمن ہو
فانہ نزلہ علی قلبک باذن	کہ اسی نے اتارا (اس قرآن کو)
اللہ مصدقا لما بین یدیہ	تیرے ذہن میں خدا کے اذن سے
وھدی وبشری للمومنین	اس کو جو مصدق ہے اپنے سے سابق
	کا اور ہدایت وبشارت ہے مومنین
	کے لئے (یعنی قرآن)

اس آیت سے ظاہر ہے کہ جبرئیلؑ نبیؐ کے ذہن تک قرآن پہونچانے کے ذمہ دار تھے۔

دفعہ ۹

نبی کا فرشتہ کو دیکھنا اور اس کی آواز سننا

۱۔ مخالفین مذہب نے اس کے متعلق یہ شبہ پیدا کیا ہے یہ کیسے ممکن ہو کہ نبی کو ایک شخص دکھائی دے اور وہ اس کی آواز بھی سنے حالانکہ حاضرین جماعت میں سے کسی اور کو نہ کچھ دکھائی دے اور نہ کوئی آواز آئے۔

۲۔ نبی کا بشر ہونا اور نوعیت میں اور انسانوں کے مماثل ہونا ثابت ہے پس اگر وہ ایسا ہے کہ فرشتوں کو دیکھے اور ان کی آواز سنے تو اس کی نوعیت عوام بشر سے جدا ہوگی لیکن یہ امر قل انا بشر مثلکم کے منافی ہے (کہدو کہ میں انسان ہوں مثل تمہارے)

جواب

شبہ اول۔ اس کا امکان عقلی تو مسلم ہے اس لئے کہ کسی نے

بنایہ تھی کہ وہ جبرئیل کو کیسے پہچانے گا اور اس کو اپنے نبی ہونے پر کیا دلیل حاصل ہوگی) قرآن مجید سے غافل ہونے کے سبب متکلمین سے اس اعتراض کا جواب نہ ہو سکا۔ ناظرین نے اوپر دیکھا کہ قرآن مجید نے کس طرح متعدد دلائل سے اس کو رفع کیا ہے۔

عاجز ہو کر شیعہ اور سنی متکلمین نے یہ جواب دیا کہ خداوند عالم اس کا یقین نبی کے ذہن میں پیدا کر دیتا ہے۔

یہ قول دو وجہ سے باطل ہے۔

اول اس وجہ سے کہ ایسا بلا وجہ یقین از قبیل خبط ہے اور نبی کے لئے مفید نہیں کیونکہ امت جب پوچھے گی کہ کس دلیل سے آپ کو اپنی نبوت کا یقین ہوا تو نبی محجوج ہو جائے گا۔ اور دین کی حجت قائم نہ ہو گی

دوم اس وجہ سے کہ کسی نظری امر کا یقین نفس کو خود شواہد پر نظر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ پس یقین ہمارے عمل ذہنی کا نتیجہ ہے۔ اور ہمارا فعل خداوند عالم خلق نہیں کر سکتا جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں۔

وصول وحی

جبرئیل امین سے قرات قرآن سن کر نبی کریمؐ اس کو دہراتے تھے۔

ثبوت۔ ذیل کی آیات میں یہ امر بیان ہوا ہے۔

قیامتہ۔ ۲۔ فاذا قراناہ فاتبع قرانہ۔ پس جب ہم پڑھائیں اس (قرآن) کو تو تو اتباع کر اس کی قرات کا

طہ ۱۲۰۔

ولا تعجل بالقرآن من قبل	اور جلدی نہ کر پڑھنے میں قبل
ان یقضی الیک وحیہ	اس کے کہ پوری ہو تجھ پر وحی اس کی

کو حق جان کر اس کا اتباع کرے. کیونکہ افعال ارادی ہی پہ ثواب و عذاب ہو سکتا۔

جدید سائنس کی تحقیق۔

ہوا کا وہ تموج جس میں موجوں کی کثرت ۱۵ فی سکنڈ ہو یا اس سے زیادہ بحیثیت آواز کے محسوس ہوتا ہے۔ اس سے کم کثرت کی موجیں سامعہ پر اثر نہیں کرتیں۔

اور زیادہ سے زیادہ کثرت کی موج چالیس ہزار فی سکنڈ ہے جو بحیثیت آواز کے محسوس ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کثرت کی موجیں سامعہ کو محسوس نہیں ہوتیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ بہت شدید تموج ہوا میں ہو سکتا ہے لیکن کوئی آواز نہیں آتی۔

اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ عموماً انسانوں کو ۴۰ فی سکنڈ سے لے کر ۲۵ ہزار فی سکنڈ کا تموج بصورت آواز محسوس ہوتا ہے ایسے لوگ خاص خاص ہوتے ہیں جن کو ۴۰ فی سکنڈ سے کم کی آواز یا ۲۵۰۰۰ فی سکنڈ سے زیادہ کی آواز محسوس ہو۔ لوگوں کی قوت سامعہ میں یہ تفاوت بکثرت مشاہدہ میں آیا ہے۔ لہٰذا اگر نبی کی قوت سامعہ ایسی ہو کہ ۴۵۰۰۰ فی سکنڈ کا تموج سن سکے اور جبرئیل کی آواز ایسی ہی سخت ہو کہ ۴۵۰۰۰ فی سکنڈ تموج پیدا کرے۔ تو ان کی آواز نبی بخوبی سنیں گے لیکن عوام الناس کو کوئی آواز محسوس نہ ہوگی۔ اور تفاوت نوعی نہ ہوگا۔ شدید القویٰ سے قرآن میں ایسی ہی قوت جبرئیل کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے محال عقلی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اس کی تائید میں ہر قوم و ہر ملک میں ایسی ہی روایات ہیں۔

اب رہا اس کا استبعاد یعنی بعید از قیاس ہونا تو ہم ابھی اس کا قرین قیاس ہونا ثابت کرتے ہیں

شبہ دوم۔ کار دہ آوازوں کے سننے میں عموماً انسانوں میں تفاوت ہے اسی طرح قوت باصرہ میں لوگوں کے درمیان بہت فرق ہے پس اگر نبی کے لئے قوت سامعہ یا باصرہ میں زیادتی ہوگی تو وہ فرق نوعی نہ ہوگا بلکہ مقداری فرق ہوگا جو مماثلت نوعی کے منافی نہیں

اس تخصیص کی وجہ

یعنی نبی کو کیوں خداوند عالم اس قدر زیادہ قوت سامعہ و باصرہ دیتا ہے کہ وہ فرشتہ کو دیکھ سکے اور اس کی آواز سن سکے درحالیکہ عوام بشر کو یہ امر میسر نہ ہو۔

وجہ یہ ہے کہ سفیر جو حامل پیام ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے انسانوں کو پیام پہونچنا ضروری ہے۔ پس نبی جو سفیر الٰہی ہے پہلے اس کے پاس کلام الٰہی پہونچے پھر اس سے عوام تک پہونچنا ضروری ہے۔ اگر کلام الٰہی نبی کے ساتھ ہی اوروں کو بھی پہونچ جائے تو اس کا رسولِ خدا ہونا ثابت نہ ہوسکے پس اگر جبرئیل پیام الٰہی لائے اور نبی کے ساتھ اوروں نے بھی اس کو سنا تو ان میں سے ہر شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جبرئیل نے یہ پیام مجھکو دیا۔ اور مفسدین کو یہ موقع ہوگا کہ وہ کہیں کہ کلام خدا اس طرح نہیں نازل ہوا ہم نے خود جبرئیل سے ایسا سنا۔ نبی کو غلط یاد ہے۔

اب رہی رویت ملک تو ملک عظیم قوت اور ہیبت رکھتا ہے۔ نبی کے پاس ملک کو آتے دیکھکر لوگ خائف ہوں گے اور ایمان لے آئینگے حالانکہ غرض تکلیف یہ ہے کہ انسان پوری آزادی اور اختیار سے شریعت

ماہیت قرآن

احکام الہی کی ضرورت ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں۔ یہی احکام کتاب اللہ کہلاتے ہیں پس قرآن مجید ان احکام الہی کا مجموعہ ہے جو بلفظہا محمد صلعم پر نازل ہوا۔

قرآن مجید میں خود اس کے متعدد اسمار کا ذکر ہے۔ وہ یہ ہیں:-

۱۔ الذکر (سب سے پہلا نام جو قرآن میں آیا) اس کا مترادف ذکری۔ تذکرہ بھی آیا ہے۔

۲۔ القرآن۔ اس کا مترادف القول اور الحدیث بھی آیا ہے۔

۳۔ الکتاب۔ اس کا مترادف الحکم بھی آیا ہے۔

یہ تینوں قرآن کے اسمار ذات ہیں۔ باقی اسمار صفات۔

۴۔ ھدی۔ ہدایت (یعنی احکام وارشاد کرنے والا)

۵۔ بشری۔ بشیر (وعدہ ثواب)

۶۔ نذر۔ نذیر (وعید عذاب)

یہ تینوں نام قرآن کے موضوع کے اجزا اور اسکی اغراض بیان کرتے ہیں۔

۷۔ الحق

۸۔ التنزیل

۹۔ البلاغ۔ یعنی پیام الہی

۱۰۔ شفار۔ ضلال و جہالت کا علاج ہے۔

۱۱۔ قول فصل۔ اسکی آیات معرکتہ الآرا مسائل کا حل ہیں۔

۱۲۔ بیان۔ تبیان۔ یعنی واضح اور مبین ہے۔

۱۳۔ البینہ۔ واضح دلیل۔

اسمار ذات وہ ہیں جو قرآن کے علم کی صورت میں صرف ہوئے ہیں۔

ماہیت نور یا روشنی

آفتاب کی روشنی سات مختلف رنگ کی شعاعوں سے مرکب ہے ان میں بڑی سے بڑی موج ۸/۱۰۰۰۰۰ سینٹی میٹر ہے (سرخ) اور چھوٹی سے چھوٹی موج ۴۲۶/۱۰۰۰۰۰۰ سینٹی میٹر ہے (بنفشئی) بعض انسانوں کی آنکھ بعض شعاعوں کا احساس نہیں کرتی وہ لوگ Colour blind کہلاتے ہیں۔
مذکورہ بالا شعاعوں سے بڑی شعاعیں بھی ہیں اور چھوٹی بھی لیکن وہ ہماری آنکھ کو محسوس نہیں۔ ہاں ایسا ظاہر ہوا ہے کہ وہ بعض جانوروں کی آنکھ پر اثر کرکے روشنی کا احساس پیدا کرتی ہیں۔
پس ہو سکتا ہے کہ نبی کی آنکھ ایسی تیز شعاعوں کا ادراک کرتی ہو جو اور انسانوں کو محسوس نہ ہوں، اور اگر جبرئیلؑ کا جسم ایسی شدت نور سے منور بالذات ہے جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہونا ہم دکھا آئے ہیں تو جبرئیل نبیؐ کو دکھائی دیں گے اور نظر عوام سے محجوب رہیں گے۔
پس نبی کی یہ خصوصیت قرین قیاس ہے اور اختلاف نوعی کا سبب نہیں۔

نوٹ

جبرئیلؑ کے جسم کا منور بالذات ہونا بعید از قیاس نہیں اس لئے کہ فطرت میں بہت سے ایسے جاندار ہیں جن کے جسم سے خود بخود روشنی نکلتی ہے۔

شامل ہیں اور قرآن کا کل بیان ان ہی پر مشتمل ہے ۔ اس سے خارج نہیں، اب ملاحظہ کیجئے کہ قرآن کس صراحت سے اپنا موضوع بحث بیان کرتا ہے ۔

۱. سورہ ص ۔ ان ھو الا ذکر للعالمین ۔ وہ (قرآن) صرف نصیحت ہے اہل عالم کے لئے ۔

۲. تکویر ۔ ان ھو الا ذکر للعالمین

۳. یوسف ان ھو الا ذکر للعالمین

۴. نور وما ھو الا ذکر للعالمین (اور وہ قرآن کچھ نہیں مگر نصیحت اہل عالم کے لئے ۔

دین کی تحقیق تفکر اور استدلال پر موقوف ہے

لہذا دین حق اختیار کرنے کی تکلیف صرف ایسے اشخاص کو ہے جو تحقیق عقلی پر مستطیع ہیں ۔ ان میں اوسط درجے کے لوگ یقیناً شامل ہیں ۔ یہ اول فریضہ ہے اور سب سے اہم فریضہ ہے ۔

۱. چنانچہ قرآن مجید میں یہ حکم بڑی تاکید سے وارد ہے کہ دین حق کا یقین دلیل عقلی سے حاصل کرو ۔ چونکہ تحقیق کا وجوب دین کا اصل الاصول ہے ۔ قرآن مجید میں یہ حکم سو مرتبہ تاکیداً آیا ہے اور اسکو مختلف صورتوں سے بیان فرمایا ہے اور ہر صورت سے متعدد مرتبہ وارد ہے ۔

۲. دین کو لوگ دو صورت سے اختیار کرتے ہیں ۔ تحقیق یعنی راہ یقین سے یا محض اس کا ظن کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں ۔ قرآن مجید نے راہ یقین کا حکم دے کر تحقیق واجب کی ہے ۔

۳. اور ظن اور راہ ظن کو حرام کر کے وجوب تحقیق کا اثبات کیا ہے ۔

۴. ظنی طریقوں میں ایک تقلید آبا ر ہے کہ ان کی پیروی میں ان کا دین بلا سمجھے اختیار کیا جاتا ہے ۔ قرآن مجید نے تقلید کو حرام کر کے وجوب تحقیق ثابت کیا ہے ۔

اسمار صفات صرف اسکی صفات کا بیان ہیں ۔ وہ اس کی خصوصیات بیان کرتے ہیں ۔

علاوہ بریں اسمار ذات قرآن کی ماہیت بیان کرتے ہیں ۔ چنانچہ الذکر یا نصیحت قرآن کے موضوع کا بیان ہے ۔

القرآن ۔ جو پڑھا گیا یا پڑھا جائے ۔ یعنی یہ وہ نصیحت ہے جو جبرئیلؑ اور نبیؐ نے پڑھ کر پہونچائی ۔

الکتاب ۔ بمعنی حکم یا احکام ۔ یعنی وہ احکام الہی ہیں جو بطور نصیحت نازل ہوئے ۔

قرآن مجید کا موضوع

قرآن مجید سے غفلت کے سبب آج تک اکثر علمار اسلام اس امر کا تعین نہ کر سکے کہ قرآن مجید کا موضوع بحث کیا ہے ۔ حالانکہ قرآن مجید نے اسکو بالتصریح بیان کیا ہے ۔

موضوع قرآن نصیحت ہے ۔ وہ نصیحت جس میں ہماری زندگی کا صحیح طریقۂ عمل بتایا گیا ہے ۔ یعنی وہ طریقہ جس سے بندہ اپنے مقصد حیات کو پہونچے ۔ چونکہ نصیحت کی غرض صرف مخاطب کی بہبودی ہے ۔ اس لئے نصیحت میں درست طریقۂ کار کے فوائد اور غلط طریقہ کے ضرر بتائے ہیں تاکہ مخاطب سوچ سمجھکر کام کرے ۔ اس لئے وعد و وعید نصیحت کا جزو ہوئے ۔ چونکہ ناصح درست طریقۂ کار پر چلنے کے لئے ہر ضروری امر بتاتا ہے کہ یہ ارشاد ہے ۔ قرآن مجید میں ارشاد بھی ہے ۔

چونکہ ناصح نصیحت کرکے مخاطب کو عمل میں اس کے اختیار اور ارادہ پر چھوڑ دیتا ہے ۔ قرآن کے احکام کی تعمیل میں خداوند عالم نے بندوں کو ان کے اختیار و ارادہ پر چھوڑ دیا ہے کہ چاہے وہ نصیحت مانیں یا نہ مانیں ۔ اس لئے قرآن کو الذکر یا نصیحت فرمایا کہ اس میں احکام ، وعد و وعید و ارشاد ہے ۔ یہ سب نصیحت میں

امن یبدء الخلق ثم یعیدہ	یا کون پیدا کرتا ہے مخلوق کو اور پھر
ومن یرزقکم من السماء والارض	ان کو لوٹا دیتا ہے ان کی پہلی حالت پر
	اور کون تم کو زمین و آسمان سے روزی
ءالٰہ مع اللہ	پہونچاتا ہے ۔
قل ھاتو برھانکم۔ ان کنتم	کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے
صادقین ۔	کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو۔ اگر تم سچے ہو

اس آیت میں اول ذات باری کے وجود پر دو دلیلوں کی طرف اشارہ ہے ایک "برہان تکوین" دوسرے "برہان ترتیب" اس کے بعد عقیدۂ شرک کا ذکر ہے ۔ اور اس کے ساتھ مشرکین سے ان کے عقیدہ پر برہان یا دلیل قطعی طلب کی ہے ۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ عقیدہ پر دلیل قطعی حاصل کرنا واجب ہے حتیٰ کہ عقیدۂ توحید پر بھی دلائل بیان فرماکر ہر عقیدہ پر دلیل کی ضرورت ثابت کی ہے ۔

برھان تکوین (امن یبدء الخلق ثم یعیدہ)

۱۔ عالم میں پیدائش و موت ۔ بننا و بگڑنا ۔ یعنی کون و فساد دونوں واقع ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔

۲۔ اگر حیات و کون اقتضائے مادہ سے ہے تو اسکی ضد موت و فساد کا واقع ہونا محال ہوگا ۔ کیونکہ مادہ سے اس کا اقتضاء ذات جدا نہیں ہو سکتا ۔ اور اگر موت و فساد ، مادہ کا اقتضاء ہے تو حیات و کون محال ہوگا ۔ اس لئے مادہ کون و فساد کی علت نہیں ۔ بلکہ ایک فاعل مختار اسکی علت ہے ۔ جو اپنے ارادہ سے مختلف اور متضاد احوال پیدا کرتا ہے ۔

برہان ترتیب

ومن یرزقکم من السماء والارض

۱۔ تمام حوادث ارضیہ و سماویہ اس غرض واحد کی طرف راجع ہیں کہ انسان ترتیب و تکمیل حاصل کرے ۔

۵۔ اصول دین کے یقین حاصل کرنے کا حکم دے کر تحقیق کو واجب کیا ہے، کیونکہ ان کا یقین حاصل ہونے کی راہ صرف تحقیق عقلی ہے۔

۶۔ اصول دین کے ظنی اعتقاد رکھنے کو حرام کرکے تحقیق کو واجب کیا ہے۔

۷۔ تحقیق اپنی اصل میں تعقل اور تفکر ہے اس لئے قرآن مجید میں بار بار تعقل اور تفکر کا حکم ہے۔

۸۔ تعقل و تفکر و یقین کو مومن کے لئے لازمی قرار دے کر تحقیق واجب کی ہے۔

۹۔ تعقل و تفکر و یقین حاصل نہ کرنے پر کافر کو مستوجب عذاب قرار دے کر تحقیق کو واجب کیا ہے۔

۱۰۔ دین کے ثبوت میں دلائل کی طرف اشارہ کرکے تعقل و تفکر کا حکم دیا، یعنی ان دلائل تک پہونچو۔

۱۱۔ تقویٰ باعث تحقیق ہے، اس لئے کہ نبی سے خبر عذاب آخرت سنکر جو احتیاط اور دفع خطر کرے گا وہ تحقیق دین کرے گا۔ قرآن مجید نے ایمان کو متقین سے مخصوص قرار دے کر تحقیق کا وجوب ثابت کیا ہے۔

۱۲۔ کفار کو دعوت اسلام دینے میں دلائل حق کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور ان دلائل سے اعراض کرنے پر منکر کو مستوجب عذاب فرمایا ہے۔

۱۳۔ حکم تحقیق کو لازم ہے کہ مخاطب تحقیق پر مستطیع ہو، پس اپنے مخاطبین کو مستطیع تحقیق قرار دے کر ان پر تحقیق کا واجب ہونا بتایا ہے۔

۱۴۔ طریقۂ تحقیق و استدلال کو انبیاء کا شیوہ قرار دیا ہے۔

۱۵۔ تقلید آباء کو کفار کا شیوہ قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی ارشادات ہیں جن کا احصار یہاں دشوار ہے۔

۱۔ دلیل قطعی حاصل کرنا واجب ہے

سورۂ نحل۔ ۷۔

پس ثابت ہے کہ یہ جماعت تحقیق پر مستطیع تھی۔ اس نے تحقیق نہ کی بلکہ ظن پر بنا کی (جسکی طرف کنتم تزعمون میں اشارہ ہے۔) اس لئے وہ مستوجب عذاب ہوئے۔

تیسری آیت

انعام ۱۵

سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اباؤنا ولا حرمنا من شیءٍ	اب مشرکین یہ کہیں گے کہ اللہ کی رضا کے خلاف ہوتا تو نہ شرک کرتے اور نہ حرام کرتے کسی چیز کو نہ ہم نہ ہمارے آباد اجداد (یعنی ہمارا دین احکام الہٰی کے مطابق ہے)
وکذالك کذب الذین من قبلھم حتی ذاقوا باسنا	اسی طرح ان سے پہلے کے لوگوں نے جھوٹ کہا یہاں تک کہ ہمارا عذاب چکھا۔
قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون	(اے رسول) کہو ان سے کیا تمہارے پاس کوئی علم یقینی ہے تو ہمکو بتاؤ تم صرف ظن کا اتباع کرتے اور صرف قیاس آرائی کرتے ہو۔
قل فللہ الحجۃ البالغہ	کہدو کہ حجت قاطع اللہ کے ساتھ ہے
قل ھلم شھداءکم الذین یشھدون ان اللہ حرم ھذا	کہو کہ لاؤ اپنے گواہ اسپر کہ اللہ نے اس بات کو حرام کیا۔

۱۔ مشرکین نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کا دین اللہ کی مرضی کے مطابق ہے اس لئے کہ ان کے آباء و اجداد اللہ کی رضا کے خلاف کرنے والے نہ تھے ان کے یہاں یہی باتیں ہوتی آئی ہیں۔

۲۔ اور انسان میں ترتیب حاصل کرنے اور تکمیل کی صلاحیت ہے۔

۳۔ لیکن ان تمام امور کا غرض واحد کی طرف راجع ہونا نہ بے شعور مادہ کے انتشار سے ہو سکتا ہے نہ اتفاقی اجتماع سے۔

۴۔ لہٰذا یہ آثار تدبر ایک فاعل مختار کے تصرف سے ہیں جس کے علم میں یہ غرض خاص پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے۔

۵۔ خدا کے وجود پر دلائل کا بیان ثابت کرتا ہے کہ جس طرح عقیدۂ شرک پر دلیل چاہیئے اسی طرح توحید پر۔

دوسری آیت

قصص ۸۔

یوم ینادیہم فیقول این شرکای الذین کنتم تزعمون ونزعنا من کل امۃ شہیدا فقلنا ھاتوا برھانکم فعلموا ان الحق للہ	جس دن وہ (اللہ) ندا کرے گا، اور کہے گا کہ وہ شرکاء (باری) کہاں ہیں جن کا تم گمان کرتے تھے۔ اور ہم ہر جماعت سے ایک گواہ جدا کریں گے اور پھر ان سے کہیں گے کہ اپنی دلیل قطعی لاؤ۔ پس ان کو علم الیقینی ہوگا کہ اللہ حق پر ہے۔

توضیح

آخرت میں بھی مواخذہ اسی طرح ہوگا کہ مشرکین سے ان کے عقیدہ پر دلیل قطعی طلب کی جائے گی۔ اور دلیل قطعی نہ ہونے پر وہ مستوجب عذاب ہوں گا۔ چنانچہ ہر جماعت مشرکین سے اُن کا ایک نمائندہ آگے لایا جائے گا، اور اس سے محاسبہ اور مطالبہ دلیل کیا جائے گا۔ اس وقت ان مشرکین کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ باطل پر تھے۔ اور خداوند عالم کا یہ مطالبہ کہ عقیدہ پر دلیل قطعی ہونا چاہیئے حق پر ہے۔

حق سے (یعنی تفکر نہیں کرتے)

۱۔ عقیدۂ شرک پر دلیل طلب فرماکر ثابت فرمایا ہے کہ ہر عقیدہ پر دلیل قطعی حاصل کرنا واجب ہے۔

۲۔ کفار کے دعوی کے مطابق شرک کا جواز خدا کی طرف سے حاصل ہے، اس لئے اس کا جواز کتاب اللہ سے ثابت ہونا چاہیئے، لیکن دو کتاب اللہ سامنے ہیں ایک قرآن دوسرے توریت۔ ان دونوں سے شرک کا جواز دکھاؤ۔ اسپر دلیل عقلی ہے نہیں۔ پس سوائے کتاب اللہ کے اور کسی طرح ثابت نہیں ہوسکتا کہ فلاں عقیدہ مرضی الہی کے مطابق ہے۔ پس کفار کا دعویٰ باطل ہے۔

۳۔ لوگوں کا حق سے اعراض کرنا (تحقیق نہ کرنا) حرام ہے۔ اس لئے کہ اسکو مقام مذمت میں وارد کیا ہے اور کفار کی روش بتایا ہے۔

۴۔ کتاب اللہ کو حجت قاطع قرار دیا ہے۔ لہذا اس کا بیان جامع و مانع ہو

۵۔ پس مکلف پر واجب ہے کہ احکام الہی قرآن سے حاصل کرے۔

پانچویں آیت

ومن یدع مع اللہ الٰھا اخر	اور جو پکارتا ہے اللہ کے ساتھ دیگر
لا برھان لہ بہ	معبود جسپر اس کے پاس کوئی برہان نہیں۔
فانما حسابہ عند ربہ انہ	تو اس کا محاسبہ اس کے رب کے
لا یفلح الکافرون	پاس ہوگا بتحقیق وہ کافروں کو کامیاب نہیں کرتا۔

اس آیت میں بالتصریح بیان فرمایا ہے کہ دین میں عقیدہ اختیار کرنا اور اسپر دلیل نہ ہونا ایسا جرم ہے کہ اسپر اللہ تعالیٰ مواخذہ کرے گا اور وہ مجرم مقصد حیات کے حصول میں ناکام رہا۔ یعنی نجات نہ پائے گا۔

۲۔ آگے اسی صورت میں بیان ہے فان شهدوا فلا تشہد معهم۔ اگر وہ شہادت دیں (تو وہ باطل ہے) پس اے رسول تم ان کے ساتھ گواہی نہ دو۔
یعنی روایات اور ظن کی بنا پر نہ کوئی عقیدہ ثابت ہے اور نہ کوئی حکم حلال و حرام۔ (یہاں سے تقلیدی شریعت کا حرام ہونا ظاہر ہے)

۳۔ اگر کتاب الٰہی سے کوئی حکم ثابت نہیں تو پیشروان مذہب کے قیاس اور اجماع کا اتباع نہ کرو۔

۴۔ مشرکین کے اس استدلال ظنی کو کہ ان کے آبا نے حکم الٰہی کے مطابق مذہب اختیار کیا ہوگا، باطل قرار دے کر آیت مطالبہ کرتی ہے کہ اگر تمہارے پاس کوئی علم یقینی ہو تو لاؤ۔ ظن پر عمل کرنا حرام ہے۔

۵۔ ظن اور قیاس کرنے والوں کا معذب بعذاب الٰہی ہونا بیان فرمایا ہے۔

۶۔ پھر آیت بتاتی ہے کہ اللہ کے پاس حجت بالغہ ہے یعنی اللہ کا دین دلیل قطعی سے ثابت ہے۔

۷۔ پس ہر عقیدہ اور ہر حکم پر دلیل قطعی چاہیئے۔

چوتھی آیت

انبیاء۔۳۔

ام اتخذوا من دونه الهة قل هاتوا برهانكم	کیا انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنائے ہیں، کہو ان سے کہ لاؤ اپنی دلیل قطعی۔
هذا ذكر من معى وذكر من قبلى بل اكثرهم لا يعلمون الحق وهم معرضون	یہ نصیحت (الٰہی) میرے پاس ہے اور میرے پہلے کی نصیحت بھی موجود ہے (ان میں کہیں شرک کا جواز نہیں) بیشک ان میں سے اکثر کو حق کا علم نہیں ہے اور وہ اعراض کرتے ہیں

عمل بربنائے ظن یا تقلید باطل ہے

مزید دلیل

اگر بربنائے ظن یا تقلید عمل کرنا درست ہو تو لازم آئے گا کہ جو اعمال ہندو یا عیسائی حکم خدا سمجھ کر کرے وہ اطاعت الہی ہوں اور مستحق ثواب آخرت ہوں کیونکہ ان سب کو ان اعمال کے حکم خدا ہونے کا ظن حاصل ہے۔ لیکن ان کے اعمال کا باطل ہونا مسلم ہے۔ لہذا عمل بربنائے ظن باطل ہے۔

دین کے اختیار کرنے میں راہ یقین کا حکم

دین قبول کرنے کا یہ حکم نہیں آیا کہ اس کا اعتقاد کر لو یا زبردستی مان لو بلکہ ایسے اعتقاد کا حکم ہے جو شک و شبہ سے مامون ہے۔ قطعی یقین ہو۔ لفظ "ایمان" کے معنی محفوظ کرنا۔ لہذا ایمان سے ایسا اعتقاد مراد ہے جو شک و شبہ سے محفوظ ہو۔ یہ یقین ہے اور نظری مسائل کا یقین صرف دلیل قطعی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

پس آمنوا باللہ ورسولہ کے معنی ہوئے اللہ اور رسول کے بارہ میں شک و شبہ سے محفوظ اعتقاد یعنی یقین حاصل کرو۔

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جس اعتقاد پر دلیل قطعی قائم ہو وہ حق ہے۔

ایمان کے معنی کو ذیل کی آیات نے اور واضح کر دیا ہے۔

بقرہ۔ ذالك الكتاب لاريب فيه هدى للمتقين الذين يؤمنون بالغيب

اس کتاب کے بارہ میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہدایت ہے ان احتیاط کرنے والوں کے لئے جو ذات غائب (اللہ) پر ایمان رکھتے ہیں۔

الذين يؤمنون بما انزل اليك

جو یقین حاصل کرتے ہیں اس کا جو

بقرہ ۱۳۔

وقالوا لن یدخل الجنۃ	اور کہا انھوں نے کہ جنت میں کوئی
الا من کان ھودا او نصاریٰ	داخل نہ ہوگا سوائے اس کے جو یہودی
تلک امانیھم قل ھاتو	یا نصرانی ہو۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں
برھانکم ان کنتم صادقین	(جنکو حقیقت قرار دیتے ہیں) کہدو
	کہ لاؤ تم اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔

یہاں نصاریٰ کا آخرت کے متعلق ایک عقیدہ باطل بیان فرمایا اور اسکو اس طرح رد فرمایا کہ ان کے پاس کوئی دلیل قطعی نہیں ہے' اس طرح ظاہر فرمایا کہ عقیدۂ آخرت پر بھی دلیل قطعی حاصل کرنا واجب ہے اور ایسے اعتقادات جو محض آرزو یا خواہش کے اقتضاء سے قائم کیے جائیں باطل ہے۔

ساتویں آیت

نساء۔ ۱۸۔

یا ایھا الناس قد جاءکم	اے انسانو! تمہارے رب کی
برھان من ربکم وانزلنا	طرف سے تمہارے پاس برہان
الیکم نورا مبینا	پہونچی اور ہم نے نازل کیا تمہاری
	طرف بیّن نور۔

نبیؐ کی نبوت پر قرآن مجید اپنے اعجاز کے سبب برہان ہے اور قرآن نور ہدایت بھی ہے۔

پس ایمان بالرسالت کے لئے بھی برہان حاصل کرنا واجب ہے۔

حاصل ان سب آیات کا یہ ہے کہ ایمان باللہ۔ ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت ہر ایک کا یقین دلیل قطعی ہی سے حاصل کرنا واجب ہے۔ اور اعمال فرعیہ میں بھی حکم الٰہی دلیل قطعی سے حاصل کرو۔ ورنہ عمل باطل ہے۔

ظن کی حرمت

یونس:۔ ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ — بہ تحقیق ظن مستغنی نہیں کرتا حق سے کچھ بھی۔

نجم:۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔

اس کلام کی بلاغت دیدنی ہے۔

اول یہ بتایا کہ ظن امر باطل ہے کیوں کہ اگر وہ فعل حق ہوتا تو ایک امر حق حاصل ہوجاتا اور حق سے ذرا استغنا ہوجاتی ہے لیکن آیت یہ بتاتی ہے کہ ظن سے ذرہ بھی حق سے استغنا نہیں ہوتی۔

دوسرے آیت نے بتایا کہ ظن حق تک نہیں پہونچاتا ہے۔ کیوں کہ اگر حق تک پہونچاتا تو اس کے ذریعہ حق سے استغنا حاصل ہوجاتی۔

تیسرے اس آیت نے بتایا کہ ہم کو حق کا احتیاج ہے اسکو حاصل کرنا چاہیئے۔ پس آیت سے ظن کی حرمت ثابت ہے۔ لہذا تحصیل یقین اور دلیل قطعی حاصل کرنا واجب ہے۔

ذیل کی آیات میں یقین اور راہ یقین کا حق ہونا بیان ہوا

۱۔ بقرہ:۔ وبالاخرۃ ھم یوقنون اولئک علی ھدی من ربھم۔ — اور وہ ہی آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ وہی اپنے رب کی ہدایت پر ہیں۔

یقینی ایمان حق ہے

۲۔ حاقہ:۔ وانہ الحق الیقین — اور بہ تحقیق وہ (قیامت) یقینی امر حق ہے۔

وما انزل من قبلك — تجھ پر نازل ہوا اور جو تجھ سے پہلے نازل ہوا۔

وھم بالاخرۃ ھم یوقنون — اور وہی آخرت کا یقین رکھتے ہیں

ان آیات میں اللہ اور رسول پر ایمان اور آخرت پر یقین طلب کیا ہے اور جب آخرت پر یقین مطلوب ہے تو اللہ اور رسول پر بدرجہ اولیٰ یقین مطلوب ہوا اس لئے کہ ان کا ثبوت ذہن سے قریب تر ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آخرت پر یقین ضروری ہو اور اللہ و رسول کا ظنی اعتقاد کافی ہو۔ لہذا یہاں ایمان اور یقین ایک ہی معنی کر صرف ہوا۔ یعنی ایمان بمعنی قطعی یقین ہے۔ اور ان آیات میں اسلام کا یقین حاصل کرنے کا حکم ہے۔

معنی ایمان کی مزید توضیح

حجرات :۔ قالت الاعراب امنا — بدوؤں نے کہا ہم ایمان لائے

قل لم تومنوا — کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔

ولاکن قولوا اسلمنا ولما — بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے۔ حال

یدخل الایمان فی قلوبکم — یہ ہے کہ یقین ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔

انما المومنون الذین امنو — مومنین صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ

باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا — ورسول کا یقین کیا پھر شک شبہ

وجاھدوا باموالھم و — نہیں کیا۔ اور اپنے اموال اور جانوں

انفسھم فی سبیل اللہ۔ — سے جہاد کیا راہ خدا میں۔

اولئک ھم الصادقون — وہی سچے ہیں۔

ان آیات میں صریحاً بیان ہوا کہ ایمان وہ اعتقاد ہے جو شک و شبہ سے محفوظ ہو یعنی یقین ہو۔

پس راہ یقین کا حکم ہوا جس کے لئے دلیل قطعی حاصل کرنا ضروری ہے۔

تقلید فی الدین کا مستوجب عذاب ہونا

زخرف ۔ وکذالك ما ارسلنا من قبلك فی قریتہ من نذیر ۔	اور اسی طرح جو نذیر بھی ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں بھیجا ۔
الا قال مترفوھا انا وجدنا اباءنا علی امتہ وانا علی اثارھم مقتدون قال اولو جئتکم باھدی مما وجدتم علیہ اباء کم	تو وہاں کے دولت والوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایک ملت پر پایا اور انہیں کے قدم پر ہم چلنے والے ہیں ۔ (رسول نے) کہا اگر میں بہتر رہنمائی تمہارے پاس لایا ۔ بہ نسبت اس کے جس پر تم نے اپنے آبا کو پایا ۔
قالوا انا بما ارسلتم بہ کافرون فانتقمنا منھم فانظر کیف کان عاقبتہ المکذبین	بولے تم جو لیکر آئے ہو ہم اس کے منکر ہیں تو ہم نے بدلہ لیا ان سے پھر دیکھ تو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا ۔

کفار کی اس روش پر کہ وہ تقلید کرتے رہے دنیا میں بھی عذاب ہوا ، اور آخرت کا عذاب بھی ان کے لئے ہے ۔ پس ثابت ہوا کہ تحقیق دین واجب ہے اور تقلید جو بھی کرے خواہ کافر یا مسلمان وہ مستوجب عذاب ہے ۔

وجوب تحقیق

تحقیق کیا ہے ؟ دلائل پر نظر کرنا ۔ تعقل و تفکر کرنا ۔ یقین بہم پہونچانا ۔ قرآن مجید اس طرح دعوت تفکر و تعقل دیتا ہے اور راہ یقین کی طرف بلاتا ہے کہ دلایل (آیات) پر غور کرو ۔

رعد ۔ ۱ ۔ ان فی ذالك لآیات لقوم	بیشک اس میں دلائل ہیں عقل سے

۳۔ واقعہ:۔ ان ھذا لھو الحق الیقین — بتحقیق یہ امر (قیامت) یقینی امر حق ہے
دونوں آیتیں ذکر قیامت سے متصل ہیں اور انہ اور ہذا کی ضمیریں اسم قیامت کی طرف راجع ہیں۔

ان آیات کی رو سے بندوں پر قیامت کا یقین بہم پہونچانا واجب ہے لیکن قیامت کا ثبوت موقوف ہے، توحید و عدل و رسالت کے ثبوت پر۔ اس لئے سب اصول دین کا یقین حاصل کرنا واجب ہے، اس لئے ان پر دلائل قطعی حاصل کرنا بھی واجب ہے۔

تقلید کا حرام ہونا

آبا کی تقلید میں دین کا اختیار کرنا اس گمان پر ہوتا ہے کہ ہمارے آبا راہ حق پر ہوں گے۔ یہ اتباع ظن ہے جس کا حرام ہونا ثابت ہوا۔ لیکن قرآن مجید نے اس بنیادی حکم کو طرح طرح بیان فرمایا ہے۔

۱۔ بقرہ ۱۷۔ واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا اولو کان اباؤھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون

جب ان سے کہا گیا کہ جو اللہ نے نازل کیا اس کا اتباع کرو تو وہ بولے نہیں بلکہ جس پر ہم نے اپنے آبا کو پایا ہے اسکا اتباع کریں گے کیا اگرچہ ان کے آبا عقل سے ذرا بھی کام نہ لیتے ہوں، اور نہ ہدایت کے طالب ہوں۔

یہاں تقلید آبا کا طریقہ کفار ہونا بیان فرماکر تقلید کو کفر ثابت فرمایا ہے۔ اور تقلید آبا کا باطل ہونا اسطرح ظاہر فرمایا ہے کہ اگر ان کے آبا نے عقل سے کام نہیں لیا تو ان کا طریقہ باطل ہے، اور باطل کا اتباع حرام ہے۔ اور اگر ان کا طریقہ تحقیق تھا تو ان کی اولاد کو ان کے اتباع میں تحقیق کرنا چاہیئے۔

تقلید آبا کا حرام ہونا متعدد آیات میں آیا ہے بنظر اختصار ہم نے ان کو یہاں نقل نہیں کیا۔

دوم۔ رہبر کی معرفت کردہ واقعی رہبر ہے — یہ نبی و قرآن کی معرفت ہے، اور ان کا من اللہ ہونا دلیل قطعی سے معلوم کرنا ہے۔

سوم:۔ رہبر کی ہدایات کا صحیح صحیح علم — یہ قرآن میں تدبر و تفکر ہے۔

چہارم:۔ رہبر کی ہدایات کے مطابق رہروی کرنا۔ — یہ عمل صالح ہے۔

اس لئے مسلمان کے لئے چار باتیں واجب ہیں۔

اول:۔ دلیل قطعی سے دین حق کا صحیح مفہوم حاصل کرنا

دوم:۔ موجودہ قرآن کے من اللہ ہونے کی دلیل قطعی حاصل کرنا۔

سوم:۔ غور و فکر سے قرآن کی ہدایات و ارشاد حاصل کرنا۔

چہارم:۔ احکام کی تعمیل کرنا۔

بغیر ان کے حقیقی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

مزید ثبوت

ذیل کی آیات میں :۔

۱۔ دین کو ظن سے حاصل کرنے کے لئے وعید عذاب ہے۔

۲۔ اہل جنت کا اس دین پر ہونا مذکور ہے جس کے دلائل نفس انسان میں اور آفاق میں موجود ہیں۔

۳۔ ان دلائل کی طرف اشارات ہیں۔

۴۔ ان پر نظر کرنے کا حکم ہے۔

۵۔ ان پر نظر نہ کرنے والوں پر زجر وارد ہے

ذاریات

قتل الخراصون — ہلاک ہیں قیاس آرائی کرنے والے (یعنی برا حال اہل ظن کا)

يعقلون — کام لینے والوں کے لئے۔

رعد۔ ۱۔ ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون — بیشک اس میں تفکر کرنے والوں کے لئے دلائل ہیں۔

بقرا۔ وقد بینا الآیات لقوم یوقنون — اہل یقین کے لئے دلائل واضح کر دیئے گئے ہیں۔

تحقیق نہ کرنا غفلت و اعراض ہے، نظر نہ کرنا اور عقل سے کام نہ لینا ہے۔
کفار کو عدم تحقیق پر اس طرح الزام دیا ہے۔

۱۔ انبیا۔۱۔ وھم فی غفلۃ معرضون — اور وہ غفلت میں توجہ نہیں کرتے۔

۲۔ مائدہ ۲۔ واکثرھم لایعقلون — اور ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے

۳۔ واقعہ۔ ولاکن لاتبصرون — لیکن وہ نظر نہیں کرتے۔

ایمان کو تحقیق لازم ہے اس لئے مومنین کی مدح میں وارد ہوا کہ وہ تعقل و تفکر کرتے ہیں اور راہ یقین کے سالک ہیں۔

آل عمران ۔ ۱۔ لآیات لاولی الالباب — یہ دلیلیں ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لئے۔

آل عمران ۲۔ ویتفکرون فی خلق السموت والارض — اور وہ تفکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمینوں کی خلقت میں۔

سجدہ ۳۔ وکانوا بایاتنا یوقنون — اور ہماری آیات پر یقین حاصل کرتے ہیں

اھدنا الصراط المستقیم

دکھا ہم کو سیدھی راہ

اس آیت نے حیاتِ دنیا کو رہروی قرار دیا ہے
ہماری رہروی درست ہونے کی چار شرطیں ہیں۔

اول۔ منزل مقصود کا معین و معلوم ہونا — یہ مبدء اور منتہی کی تحقیق ہے کہ خدا کو ہماری تربیت و تکمیل منظور ہے

لایخلف اللہ وعدہ	اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
ولکن اکثر الناس لایعلمون	لیکن اکثر انسانوں کو اس کا یقینی علم نہیں
یعلمون ظاہرا من حیاۃ الدنیا	وہ ظاہر نظر سے حیات دنیا کو جانتے
وھم عن الاخرۃ ھم غافلون	ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔
اولم یتفکروا فی انفسہم	تو کیا انھوں نے اپنے نفس پر تفکر نہ کیا
ماخلق اللہ السماوات والارض	اللہ نے آسمانوں اور زمین کو صرف
الا بالحق۔ واجل مسمی	جیسا چاہئے تھا پیدا کیا۔
وان کثیرا من الناس	اور ایک زمانہ معین کے لئے
بلقای ربھم لکافرون	حال یہ ہے کہ اکثر انسان اپنے رب
	کی لقا سے منکر ہیں۔

وجوب تحقیق کا بیان

قرآن مجید میں بکثرت دلائل اصول کی طرف اشارات ہیں اور تحقیق کی دعوت ہے۔

جہاں ایسے اشارات ہیں ان کی طرف اس طرح متوجہ کیا ہے۔

۱۔	ان فی ذالک لایات	اس میں نشانیاں ہیں
۲۔	لایات لقوم یعقلون	یہ نشانیاں عقل سے کام لینے والوں کے لئے ہیں
۳۔	لایات لاولی الالباب	عقل سے کام لینے والوں کے لئے یہ نشانیاں ہیں
۴۔	لایات لقوم یتقون	احتیاط کرنے والوں کے لئے یہ نشانیاں ہیں۔
۵۔	ذالک من آیات اللہ	یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔
۶۔	قد بینا الایات لقوم یوقنون	اہل یقین کیلئے نشانیوں کو واضح کردیا ہے
۷۔	کذالک یبین اللہ لکم الایات	اسطرح اللہ اپنی نشانیوں کو واضح کرتا ہے
۸۔	ویبین اللہ لکم الایات	اور تمہارے لئے اللہ نے اپنی نشانیوں کو واضح کیا

الذین فی غمرۃ ساھون	وہ جو غفلت میں بھولے ہیں
یسئلون ایان یوم الدین	پوچھتے ہیں کہ یوم جزا کب ہوگا
یوم ھم علی النار یفتنون	اس دن جبکہ وہ نار میں مبتلا ہوں گے
ذوقوا فتنتکم ۔ ھذا الذی	اور کہا جائے گا کہ چکھو اپنی فتنہ پردازی
کنتم بہ تستعجلون	یہ ہے وہ جس کی جلدی تم کرتے تھے ۔
ان المتقین فی جنت وعیون	متقی جنات و چشموں میں ہوں گے
آخذین ما آتاھم ربھم	پائے ہوئے اپنے رب کی عطائیں
انھم کانوا من قبل ذالک محسنین	وہ لوگ پہلے محسن تھے ۔
کانوا قلیل من الیل یھجعون	اور رات کا کم حصہ آرام کرتے تھے
وبالاسحارھم یستغفرون و	اور صبح کو بھی استغفار کرتے تھے
فی اموالھم حق للسائلین	اور ان کے اموال میں سائلوں و مفلسوں
والمحروم ۔	کا حق تھا ۔
وفی الارض آیات للموقنین	اور اہل یقین کے لئے زمین میں نشانیاں
	ہیں (یعنی دلائل)
وفی انفسکم افلا تبصرون	اور تم اپنے نفوس پر کیوں نہیں نظر
وفی السماء رزقکم وما	کرتے اور آسمانوں میں تمہارا رزق
توعدون	اور وعدہ ہے ۔
فورب السماء والارض	پس سماء وارض کے رب کی ذات
انہ لحق مثل ما انکم تنطقون	شاہد ہے کہ وہ (قیامت) ایسی
	ہی یقینی ہے جیسے کہ تم باتیں کر رہے ہو

ان ہی دلائل کو جن سے وجوب تحقیق ثابت ہے، سورۂ روم میں اسطر
بیان فرمایا ہے ۔

وجوب تحقیق کے نتائج

تعارف میں دلائل عقلی سے اور یہاں قرآن سے ہم نے ثابت کر دیا کہ تحقیق دین واجب ہے اور اس کا یقین دلائل قطعیہ سے بہم پہونچانا ضروری ہے بغیر اس کی کوئی حقیقی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

(۱) لہذا دین حق یا اسلام کا قبول کرنا اسی پر واجب ہے جو تحقیق کی استطاعت رکھتا ہو۔ یعنی علم و فہم اس درجہ پر ہو کہ تحقیق عقلی کر سکے

۲۔ لہذا ایسے جاہل و کم فہم برائے نام مسلم و غیر مسلم سے جو تحقیق کی استطاعت نہ رکھتے ہوں اسلام قبول نہ کرنے پر مواخذہ نہ ہوگا۔ صرف تکلیف عقلیہ سے وہ مکلف ہیں۔

۳۔ لہذا مسلمانوں میں سے صرف وہ لوگ جنت کے سزاوار ہوں گے جن کو تحقیق سے معرفت و علم کا یہ بلند درجہ حاصل ہو اور ان کے اعمال صالح ہوں۔

۴۔ اور غیر مسلموں میں سے ایک کثیر جماعت کا جو مستطیع تحقیق نہیں جہنم جانا ضروری نہیں۔

۵۔ کافر کے معنی ہے رد و انکار کرنے والا۔ پس کافر وہ ہے جو مستطیع تحقیق ہو اور اسلام اس پر عرض کیا گیا ہو اور اس نے بلا تحقیق کئے اس کو رد کر دیا ہو

۶۔ جاہل و کم فہم غیر مسلم جو غیر مستطیع تحقیق ہیں ان کو کافر قرار دینا اور ہر کافر کو جہنمی قرار دینا خداوند عالم کو ظالم ٹھہراتا ہے۔

چونکہ عموماً علماء اسلام نے وجوب تحقیق سے انکار کیا ہے بلکہ محض اعتقاد اسلام کو کافی سمجھتا ہے۔ تو ان کے مسلک پہ لازم آتا ہے کہ ہر دین و مذہب کا اعتقاداً بلا وجہ ترجیح اختیار کرنا جائز ہو۔

۹۔ وفی الارض ایات للموقنین — اور زمین میں نشانیاں ہیں اہل یقین کیلئے

۱۰۔ اولم یتفکروا فی انفسہم — کیا انھوں نے تفکر نہ کیا اپنے نفوس میں

۱۱۔ وفی انفسکم افلا تبصرون — اور اپنے نفوس پر وہ کیوں نہیں نظر کرتے

۱۲۔ ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون — اس میں اہل فکر کے لئے نشانیاں ہیں

ان فی ذالک لایت کی تکرار حسب ذیل سورتوں میں ہے ۔

۱۔ " انعام ۱۰

۲۔ " رعد ۱ میں دو مرتبہ

۳۔ " نمل ۱

۴۔ " ابراہیم ۸

۵۔ " حجر ۲

۶۔ " نحل ۲

۷۔ " طہ ۳

۸۔ " مومنین ۳۔۴ چار مرتبہ

۹۔ " روم ۳

۱۰۔ " عنکبوت ۵۔۶

۱۱۔ " زمر ۴ دو مرتبہ

۱۲۔ " شوری ۲

۱۳۔ " جاثیہ ۴

۱۴۔ " لقمان ۲

۱۵۔ " سبا ۳

۱۶۔ " سجدہ

ذالک من آیات اللہ کی تکرار حسب ذیل سورتوں میں ہے

۱۔ کہف ۲ — ۲۔ اعراف ۳

کے سوا باقی ادیان کا باطل ہونا مسلم۔ لہذا لازم آتا ہے کہ باطل کا اختیار کرنا جائز ہو۔ اور وہ بداہتاً غلط ہے۔

تحقیق حق کے یہ معنی ہیں کہ اصول دین کا یقین دلائل قطعیہ سے حاصل کرے۔ اس کے خلاف تقلید میں لوگ اپنے بزرگوں کے دین کو اس گمان پر اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کے خیالات درست ہی ہوں گے اس لئے ان کو دین کی صحت کا صرف ظن یا گمان ہوتا ہے۔ یقین نہیں ہو سکتا۔ ان کا یہ فعل حرام ہے اس لئے کہ باطل کی طرف لے جانے والا ہے صرف امر حق پر دلیل قطعی قائم ہو سکتی ہے۔ اس لئے دین حق کے اختیار کے لئے واجب کی گئی ہے۔

اگر کسی مستطیع تحقیق نے صحیح عقائد کو بھی تقلیداً اختیار کیا تو اس نے وہی فعل کیا جو ایک ہندو پارسی یا عیسائی نے اپنا اپنا دین اختیار کرنے میں کیا جس پر اس سے مواخذہ اور عذاب ہونا مسلم ہے لہذا تقلیدی مسلمان بھی اس فعل پر مستوجب عذاب ہوگا۔ اسلام کو تقلیدی مذہب قرار دے کر ان مسلمانوں نے اس کو قبول نہیں کیا بلکہ رد کر دیا۔

اول تو تقلیدی مذہب والے کے عقائد کا درست ہونا دشوار ہے اس لئے کہ وہ ان کے مفاہیم پر غور نہیں کرتا۔ اور اگر وہ ابتداءً صحیح بھی ہوں تو بہت جلد مسخ ہو جاتے ہیں۔

وجوب تحقیق پر بعض شبہات

تقلیدی لوگ کہتے ہیں کہ عوام الناس کی استطاعت سے باہر ہے کہ تحقیق کریں اس لئے ان کو سوائے تقلید کے چارہ نہیں۔

ان لوگوں نے بہت سے غیر معقول عذرات تراشتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے بلا وجہ اعتقاد اسلام کیا ہے اور ہم کو اس کا یقین حاصل ہے لیکن یہ محال ہے۔ اس لئے کہ مسائل نظری میں بلا دلیل یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔ خدا کا وجود، رسول کی رسالت۔ اور حیات آخرت نظری مسائل ہیں بدیہی نہیں کہ ہر انسان ان کو بلا تامل قبول کرے

بعض علماء نے کہا کہ دلیل حاصل کرنا واجب ہے لیکن صحت اسلام کی دلیل عوام الناس میں موجود ہے

یہ بداہتہً غلط ہے۔ عوام بلکہ اکثر خواص بھی نہ اسلام کا صحیح مفہوم جانتے ہیں اور نہ اس کی صحت کے دلائل۔

بعض نے کہا کہ ہمارے یقین کی وجہ یہ ہے کہ جب نبی کا صادق ہونا معلوم ہوا تو ان کی ہر بات یقینی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کسی مدعی نبوت کا واقعی نبی ہونا خود دلیل کا محتاج ہے اور اس دلیل کا حاصل کرنا تحقیق اصول ہے۔ پس تحقیق ضروری ہوگی۔

تقلید کا ناجائز ہونا

اوپر ثابت ہوا کہ دین حق کا اتباع تحقیق حق اور راستی عمل ہے لہٰذا تحقیق کو چھوڑ کر صرف لوگوں کے کہنے سے دین قبول کر لینا دین حق کے منافی ہے یہ ظاہر ہے کہ علمی تحقیق اور عمل راست کے التزام سے فضائل پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے خلاف سے پستی و دنائت پیدا ہوتی ہے۔ دین یا مذہب کے اختیار کرنے میں تقلید جائز نہیں ہے کیونکہ اگر یہ جائز ہو تو ہر مذہب کا اختیار کرنا جائز ہوگا لیکن دین حق

ایسا اعتقاد بغیر تحقیق کے مسائل نظری میں ممکن نہیں۔

پھر یہ شرط ہے کہ یقین اس درجہ ہو کہ انسان کی روش عموماً دینداری کے مطابق رہے۔

وہ مفاسد جو ظنی دین سے پیدا ہوئے

یہ لوگ کہتے ہیں کہ تقلیدی مسلمانوں میں ایسے متقی و پرہیزگار ہیں جو حمایت دین میں جان نثار کرنے کو آمادہ ہیں اور وہ جنھوں نے جانیں نثار کر دیں پھر کیا وجہ کہ ان کو سچا مسلمان نہ سمجھیں۔

جواب

ایسے لوگ عیسائیوں ہندوؤں اور بہائیوں وغیرہ میں بھی ہیں اور ہو سکتے ہیں ان میں متقی و پرہیزگار بھی ہیں اور ایسے بھی جنھوں نے اپنے مذہب پر جان نثار کی لیکن ان سب کا مستوجب عذاب ہونا تم کو مسلم ہے لہٰذا ایسے مسلمان بھی اگر مستطیع تحقیق تھے تو وہ مستوجب عذاب ہیں۔ ان لوگوں کے ظنی اعتقاد کا یقینی نہ ہونا بالوجوہ ظاہر ہے اول اس طرح کہ تقلیدی مذہب والے جب مخالف ماحول میں آجاتے ہیں اور ان پر عقلی اعتراضات کی بوچھار ہوتی ہے تو ان کا مذہب و اعتقاد ہوا کی طرح اڑ جاتا ہے چنانچہ کالج میں تعلیم پانے والے ہندو مسلم نوجوان اپنے مذہبی عقائد کو چھوڑ کر نیچریت یا اشتراکیت کا شکار ہو رہے ہیں۔

دوم اس وجہ سے کہ سب روایتی مذہب والے متضاد باتوں کا اعتقاد رکھتے ہیں اب کسی کو اگر ایک بات کا یقین حاصل ہو تو وہ اس کی ضد کو فوراً رد کر دے گا۔ لیکن جب ایک بات کا پورا یقین نہ ہو

جواب

اس کا جواب ہم اوپر دے آئے ہیں کہ جو تحقیق پر قادر نہیں اس پر واجب نہیں کہ دین حق اختیار کرے
وہ جس جماعت میں رہتا ہے اس کے ظاہری قوانین معاشرت کی پابندی از روئے تکلیف عقلیہ اس سے متعلق ہے۔

دوسرا شبہ

اگر تقلید حرام ہے تو غیر مستطیع تحقیق کا یہ اقرار کہ اللہ ایک ہے اور محمد اس کے رسول ہیں اور میں ایمان لایا ہوں یعنی یقین رکھتا ہوں۔ فعل حرام ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ نبی نے یہ اقرار عامۃ الناس سے لیا۔ درحالیکہ ان میں بہت سے تحقیق پر قادر نہ تھے۔

جواب

اس شبہ کا جواب خود قرآن مجید میں موجود ہے

قالت الاعراب امنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم	بدوؤں نے کہا ہم ایمان لائے کہدے کہ تم ایمان نہیں لائے۔ بلکہ یہ کہو کہ مطیع ہوئے درحالیکہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔
انما المومنون الذین امنو باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا و جاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ۔	مومنین صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر شک وشبہ نہیں کیا اور راہ خدا میں کوشش کی اپنے اموال اور جانوں سے

یہاں ایمان ایسے اعتقاد کو فرمایا جس میں شک وشبہ باقی نہ رہے

و آخرت کے بارہ میں ایسا ضعیف الاعتقاد کر دیا کہ بے تحاشا دنیا طلبی میں مبتلا ہیں اور خوف آخرت سے غافل ہیں۔ چنانچہ ایسے مسلمان بے تکلف کذب و مکر و جعل و فریب اور رشوت ستانی کرتے ہیں۔

تقلید کا ساتواں ضرر جو عظیم ہے

تقلیدی کو اپنے عقائد کا کوئی معین اور محصور مفہوم حاصل نہیں ہوتا نہ اللہ کا نہ رسول کا۔ اس نے یہ نام سنے ہیں اور اس کو ان کا ایک مبہم اور غیر معین مفہوم ہے۔ اس کے خلاف تحقیق کرنے والے کو لامحالہ ان کا معین مفہوم حاصل ہوگا۔ اس لئے کہ وہ ان کی دلیل قطعی پر نظر کرتا ہے اور دلیل ہمیشہ معین مفہوم پر قائم ہوتی ہے۔

مثلاً ذات باری کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذات کامل یعنی مستجمع صفات کمال۔ اس مفہوم سے دلیل قائم ہوتی ہے کہ ذات کامل موجود ہے اس لئے کہ موجود بالذات ہونا کمال ہے۔ اور ذات کامل اس کمال سے خارج نہیں ہو سکتی۔

اور رسول وہ شخص ہے جو بندوں کو خدا کے احکام و وعدہ وعید پہونچانے کو خدا کی طرف سے مامور ہو اور اس لئے ان کی قولی اور عملی تبلیغ کرنے والا ہو اس لئے ضرور ہے کہ اس کا ہر قول و فعل عین صواب ہو اور آخرت سے مراد یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ حیات ملے گی اور وہ حیات اس کی مکتسبہ اہلیت کے مطابق ہوگی۔

ظنی مذہب والے کو صرف یہ معلوم ہے کہ اللہ خالق عالم ہے وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ عرش پر بیٹھا ہے اور ہر شب جمعہ آسمان اول سے زمین والوں کو جھانک کر دیکھتا ہے حال یہ ہے کہ ایک خالق

صرف گمان ہو اس کی ضد کے بھی صحیح ہونے کا گمان ہو سکتا ہے چونکہ تقلیدی مذہب والا مطالب پر غور نہیں کرتا اس لئے اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے بہت سے عقائد ایک دوسرے کے خلاف ہیں اور جو غور کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ دین کی باتیں ایسی ہی متضاد ہیں چنانچہ ایک ذی علم شاعر کا شعر ہے:-

گہہ چنیں نماید وگہہ ضد ایں
جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

پس ثابت ہے کہ ان لوگوں کا اعتقاد قطعی و یقینی نہیں ہوتا

تیسرا ثبوت - چونکہ عموماً مسلمانوں کا دارومدار تقلید پر ہے ان کو اللہ ورسول و آخرت کا صرف ظن ہے۔ اس لئے وہ احکام دین کے خلاف فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر ان کو اللہ اور آخرت کا یقین ہوتا تو وہ عذاب آخرت کے خوف سے اس روش پر نہ ہوتے۔ جس کو یقین ہے اس کی عمومی روش ضرور صالح ہے۔ پس اسلام کو تقلیدی مذہب بنا کر اول تو مسلمانوں کو مرتبہ عاقل سے گرا دیا اور پستی اخلاق پیدا کر دی

دوم - اسلام کو ایک بے بنیاد عقیدہ بنا دیا اور دیگر باطل ادیان کا مماثل قرار دیا۔

سوم - اس کے نتیجہ میں اسلام کا اعتقاد مسلمانوں میں اس قدر ضعیف ہو گیا کہ وہ نیچریت اور اشتراکیت کا شکار بن رہے ہیں۔

چہارم - اسلام کو متضاد عقائد کا مجموعہ بنا دیا۔

پنجم - اسلام کو روایتی مذہب بنا کر وضع حدیث کا راستہ کھول دیا۔ کروڑ لاکھ منقولہ احادیث میں محدثین کے نزدیک بھی اسی فیصدی وضعی ہیں۔

ششم - اسلام کو تقلیدی مذہب بنا کر مسلمانوں کو خدا رسول

آٹھواں ضررِ عظیم

چونکہ تقلیدی مذہب غیر معقول ہوتا ہے اور اکثر مولوی صاحبان اعتراضات کے جواب سے عاجز ہوتے ہیں۔ اس لئے رازہ پرستی اور تجاہل میں پناہ لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ رازہائے الوہیت اور اسرارالہی ہیں ان کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ ان فقاوں سے یہ لوگ ایک طرف تو اپنے مقلدوں کو تسلی دیتے ہیں۔ دوسری طرف خود صاحب راز بنتے ہیں اور معترضین سے کہتے ہیں کہ انسان کی ہستی کیا اور اس کی عقل کیا۔ حالانکہ خداوند عالم نے انسان کو پیدا کرکے اپنی معرفت کا حکم دیا ہے اس لئے ضرور ہے کہ انسان میں حقائق کے ادراک کی قوت رکھی ہے۔ قرآن مجید میں سیکڑوں بار تعقل وتفکر کا حکم دیا ہے۔ خدا کے یہ احکام ثابت کرتے ہیں کہ اس نے انسان کو ایسی قوت دی ہے کہ وہ حقیقت کو پہونچ سکے۔

دین حق کا مفہوم اور اس کی معقولیت ہم اوپر واضح کر آئے ہیں۔ اب دیکھیئے کہ اس کے خلاف عموماً مسلمانوں نے کیا مذہب اختیار کیا اور عبرت حاصل کیجیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ خداوندعالم نے ازل میں یہ معین کردیا ہے کہ میں بلا وجہ فلاں فلاں اشخاص کو جنت میں جگہ دونگا اور فلاں فلاں شخص کو بلا وجہ بغیر کسی خطا وقصور کے ابدالآباد تک جہنم میں رکھونگا انسان کو مجبور محض پیدا کیا ہے۔ وہ خود کوئی کام نہیں کرسکتا۔ خدا ہی سب کام اس کے ہاتھ پیر لیکن اپنی قدرت سے کرتا ہے۔ کوئی شخص نہ اچھے کاموں سے ثواب یا جنت کا مستحق ہوتا ہے نہ برے کاموں سے عذاب کا۔

اب اگر پوچھو کہ اس صورت میں چاہیئے تھا کہ پیدا کرتے ہی انسانوں کو جنت اور دوزخ میں رکھدیتا۔ اس کی کیا ضرورت ہوئی کہ یہاں پیدا کیا اسکے

عالم ماننا نہ ایمان باللہ ہے نہ اعتقاد توحید ہے۔ اس لئے کہ عیسائی ایک عیسیٰ کو اور نصیری حضرت علیؑ اور ہندو ایک برہما کو خالق عالم مانتے ہیں اور ان سب کا مشرک ہونا مسلم ہے۔

تقلیدی مسلمانوں کے سامنے تصوف کا جب یہ اصول آیا کہ ہر چیز اور ہر انسان اللہ ہی ہے۔ سوائے اس کے کوئی موجود نہیں تو وہ ایسا ہی ماننے لگے۔ اس کے علاوہ اور بھی باطل عقائد انہوں نے قبول کئے۔

تحقیق کرنے والے پر عیاں ہے کہ ان میں سے ہر صورت میں ذات کامل کے لئے نقص لازم آتا ہے اور وہ محال ہے۔ لہذا ہر ایسا عقیدہ باطل ہے۔ تقلیدی مذہب والا ایک طرف تو ہر حدیث سے مسائل میں استناد کرتا ہے یعنی قول وفعل رسول کو عین صواب مانتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بھی قائل ہے کہ رسول سے فعل وقول میں خطائیں ہوئی ہیں۔ یعنی متضاد باتوں کا اعتقاد محقق جانتا ہے کہ اگر رسول سے خطا ہونا تسلیم کر لیا جائے تو جس قدر احکام ووعد ووعید رسول نے پہونچائے ہیں سب میں خطا کا احتمال قائم ہو کر شریعت کا انہدام ہو جائیگا۔ اور اس کا رسول بنا کر بھیجنا فعل عبث ہوگا۔

ظنی مذہب والے یہ بھی مان لیتے ہیں کہ حیات آنحضرت صرف روحانی ہوگی تحقیق کرنے والا جانتا ہے کہ روح مجرد کو نہ آلام جسمانی پہنچ سکتے ہیں اور نہ وہ جسمانی نعمات سے لذت یاب ہو سکتا ہے۔ لہذا یہ عقیدہ باطل ہے خداوند عالم نے جب انسان سے تمام نعمتوں کی عطا کا وعدہ فرمایا ہے تو ایفائے عہد کو لازم ہے کہ انسان کو آخرت میں اسی ہیئت سے پیدا کرے جو اس وقت ہے لہذا معاد جسمانی ضروری ہے۔

روز ازل کی قسمت والے نظریہ سے یہ نظریہ لوگوں کو بہتر نظر آیا اور کثرت سے مسلمانوں نے اس کو قبول کیا۔ اس کی قبولیت عام کے کئی سبب ہو گئے۔

۱۔ دنیا طلب کو درویشوں کی دعا سے اپنی مراد بر آنے کی امید۔

۲۔ صوفیوں نے دعویٰ کیا کہ ان کو ریاضت سے کشف حاصل ہو جاتا ہے لوگوں کو اس کی رغبت ہوئی۔

۳۔ اس مذہب کا طریقہ عبادت بہت خوش کن تھا۔

۴۔ گانا سننے کو عبادت قرار دیا۔ شعراء میں تصوفانہ مضامین عام ہو گئے اور شعر کے ذریعہ اس مذہب کا بہت کچھ نفوذ ہوا۔

۵۔ ظالم بدکار اور بدمعاش اس مذہب میں آکر قیود شریعت سے آزاد ہوئے ان کے سابق گناہ بھی بے حقیقت قرار پائے۔ یہانتک کہ بے شمار علمائے اشاعرہ جو اپنے نظریہ سے شکوک میں مبتلا تھے تصوف میں آکر اطمینان پانے لگے اور گانا سننے کے قائل ہو گئے۔

فاعتبروا یا اولی الالباب

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تقلیدی مذہب والے کس قدر بے بصیرت ہوتے ہیں ان کو یہ نظر نہ آیا کہ تصوف بالکل اسلام کی نفی اور ضد ہے۔ شریعت کا رد ہے عشق بازی اور موسیقی کا جواز ہے۔ تقویٰ اور فسق و فجور کو یکساں قرار دیتا ہے چونکہ ان کو دین حق کا صحیح مفہوم حاصل نہ تھا اس لئے جس کی سنے مانتے گئے دین حق یہ کہتا ہے کہ خدا کی ذات کامل ہے نقص اور احتیاج سے منزہ ہے تصوف کہتا ہے کہ اس کو اپنا جلوہ رعنائی کی احتیاج ہوئی۔ دین حق کہتا ہے کہ ذات باری تغیر اور تاثرات نفسانی

بعد پھر دوبارہ زندہ کرے گا۔ آخر اس نے رسول کیوں بھیجے۔ اور اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔ ان میں بندوں کی طرف احکام کیوں نازل فرمائے۔ تو یہ لوگ جواب دیتے ہیں کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

اس صورت میں اگر مخالف یہ کہے کہ جب خدا کی باتیں کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تو تمہاری سمجھ میں یہ کیسے آیا کہ اسلام دینِ الٰہی ہے اور خدا نے ایسا ایسا ارادہ کیا ہے۔ تم جو کچھ کہتے ہو سب خرافات ہے تو جواب ندارد

زوالِ ضررِ عظیم

ظاہر ہے کہ ایسے باطل عقائد سے انسان کی عقل اور ضمیر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ مسلمان یہ اعتقاد لئے ہوئے بیٹھے تھے کہ اسلام پر مذہب تصوف کا حملہ ہوا۔ یہ لوگ وحدتِ وجود کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنا یہ نظریہ پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ حسن کامل ہے۔ حسین شخص یہ چاہتا ہے کہ دیکھنے والوں کو اپنا حسن دکھائے۔ اور اپنا گرویدہ بنائے (جیسے کوئی آزاد عورت بناؤ سنگار کرکے عشاق کی طالب ہوتی ہے) سوائے خدا کے اور کوئی موجود نہ تھا کہ دیکھے (اور غیر کو خدا پیدا نہ کر سکتا تھا) اسی کی ذات ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی اس لئے تمام کائنات کو اپنی ذات کے اجزا میں تغیر کرکے پیدا کیا۔ اسی کا حسن ہے جو ہر ذات میں جلوہ گر ہے پس انسان اگر حسینوں کے عشق میں مبتلا ہو۔ گانا سنے۔ چمن کی سیر کرے تو حسنِ باری کا گرویدہ ہو رہا ہے۔ یہی چاہیئے۔ یہی عبادت ہے۔

بالآخر جب حسن کامل کو سیری ہو جائے گی سب موجودات اس کی ذات میں فنا ہو جائے گی نیکوکار اور بدکار کا انجام ایک ہے۔ شریعت کے احکام ظاہر داروں کے لئے ہیں حقیقت یہ ہے جو تصوف بیان کرتا ہے۔

شریعت سے آزاد ہوئے۔

علیٰ ہذا التصوف نے ہر محل پر اسلام و اخلاق اور عقل کے احکام کی نفی کی اور تقلیدی مذہب والے ایسے نادان کہ انہوں نے تصوف کو عین اسلام سمجھا اور آنکھیں بند کرکے قبول کیا۔

عقلیت اور تقلیدی مذہب کا تصادم

عہد عباسی میں بکثرت علوم حکمیہ کی کتابوں کے ترجمہ عربی میں ہوئے منطق و فلسفہ شائع ہوا تو بعض علمائے اسلام نے منطق اور فلسفہ کی اصطلاحات میں اصول اسلام پر دلائل قائم کئے اور معترضین کے اعتراضات کا رد کیا یہ روش اہل علم میں مقبول ہوئی۔

تقلیدی علماء نے اپنی کمزوری دیکھ کر اس کو کفر کے فتوؤں سے دبانا چاہا۔ یہانتک کہا کہ جس شخص کو عرض و جوہر بولتے دیکھو اس کو کافر سمجھو علم کلام کو بدعت قرار دیا۔ اور کہا کہ صحابہ ان مباحث سے عاری تھے اور وہ بہترین مسلمان تھے۔ لہذا یہ علم ناجائز ہے۔ علم کلام ایک قلیل جماعت میں محدود رہا۔ عوام جہالت پسند تھے۔ ان پر تقلیدی علماء کا اقتدار قائم رہا اور ان کی پرستش کو ان کے مقلد کافی تھے۔

لیکن زمانہ علم و تمدن میں ترقی کرتا رہا۔ اور مذہب تقلید کی بدولت مسخ ہوتا رہا۔

اس آخر دور میں تقلیدی مذہب پر عقلیت کا ایسا زبردست حملہ ہوا کہ اس کو بیخ و بن سے ہلا دیا۔ انیسویں صدی میں علوم مغربی مشرق میں پہونچنا شروع ہوئے۔ انگریزی کالجوں میں علوم عقلیہ کی تعلیم ہونے لگی

سے بری ہے اس لئے کہ ہر متغیر ذات ممکن الوجود ہے اس لئے رنج وغم غصہ والم وسرور اس کی ذات پر طاری نہیں ہوتے۔

تصوف کہتا ہے کہ نہیں اس کو بغیر جلوہ دکھائے بے چینی والم تعاجب لوگوں نے اس کا حسن دیکھا اور گرویدہ ہوئے تو اس کو سرور ہوا۔

دین حق کہتا ہے کہ وہ مخلوقات کا خالق ہے۔ موجودات کو جو اس کی ذات سے جدا ہیں۔ عدم سے وجود میں لایا۔

تصوف کہتا ہے کہ سوا خدا کے کوئی موجود نہیں۔

دین حق کہتا ہے کہ مخلوقات کا وجود حقیقی ہے۔ ان کے افعال حقیقی۔ اس کے افعال کی برائی بھلائی حقیقی۔ اس لئے انسان پر عذاب و ثواب ہونا درست ہے۔

تصوف کہتا ہے کہ مخلوقات کا وجود وہمی ان کے افعال اور ان کی برائی بھلائی وہمی ہے احکام شریعت وہمی باتوں سے متعلق ہوئے اس لئے بے حقیقت ہیں۔

دین حق کہتا ہے کہ حیات آخرت جاودانی ہے کبھی ختم نہ ہوگی۔

تصوف کہتا ہے کہ نہیں سب کو فنا ہے۔ سب فنا فی الذات ہونگے

دین حق کی سراسر یہ تعلیم ہے کہ خواہشات کو عقل کے قابو میں رکھو اور ہوا و ہوس کو راہ نہ دو۔

تصوف کہتا ہے کہ عقل کچھ نہیں عشق وقوالی عبادت ہے۔

دین حق کہتا ہے کہ احکام شریعت کا اتباع ہر مکلف پر واجب ہے خواہ وہ کسی درجہ میں ہو۔ رسول ہو کہ نبی۔

تصوف کہتا ہے کہ نہیں۔ جو معرفت اور حقیقت کو پہونچ گئے ان پر احکام شریعت کا اتباع واجب نہیں۔ رسول و نبی تو آخر تک شریعت کے پابند رہے۔ مگر مست قلندر ان سے بھی آگے ترقی کر گئے۔ اور قیود

کہ اگر قرآن مجید میں اسلام کا یہی مفہوم بیان ہوتا تو سب علماء اسلام اسی مفہوم کو اختیار کرتے۔ علاوہ بریں اگر بعض آیات قرآن سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے تو اس کا خلاف بھی بعض آیات سے ثابت ہے۔ اور آیات قرآن متعدد معانی کی متحمل ہیں اس لئے قرآن مجید سے کسی بات کا ثابت ہونا مشکل ہے۔

جواب

عموماً علمائے اسلام نے اسلام کا ایک نامعقول مفہوم جو ان کے مذہب جاہلیت سے حاصل تھا اختیار کر کے اس کی تائید آیات قرآن سے چاہی حالانکہ پہلے ان کو یہ تحقیق کرنا چاہئے تھا کہ اسلام کا صحیح مفہوم کیا ہے اگر وہ مفہوم دلیل عقلی سے ثابت نہیں ہے تو کفار پر اسلام کی حجت قائم نہ ہوگی حالانکہ خداوند عالم فرماتا ہے فللہ الحجۃ البالغۃ۔ اور نہ انہوں نے اس پر غور کیا کہ اس صورت میں کفار پر اسلام کا اختیار کرنا عقلاً واجب نہ ہوگا اور نزول شریعت عبث قرار پائے گا۔

ان علماء نے یہ دیکھ کر بے شمار آیات قرآن ان کے منافی ہیں ایک یہ حیلہ اختراع کیا کہ قرآن مجید مبہم اور ناقص الدلالت ہے اس کی بہت سے آیات مبہم ہیں جن کو انہوں نے متشابہات کہا اس طرح جتنی آیات ان کے عقائد کے خلاف تھیں ان سب کو متشابہات کہہ کر ان سے جان بچائی۔

برہان علم العلم

وجود باری پر علم العلم سے جو دلیل قائم ہے اس کی طرف قرآن مجید کی سب سے اول دو آیتوں میں اشارہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین۔

ابتداء کلام اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے۔ اللہ کی ذات میں ہم

علم سیاسیات۔ اقتصاد۔ منطق۔ ریاضی سائنس وغیرہ۔

طلبار کے اذہان پر عقلیت کا غلبہ ہوا اور ذہنیت بدلنے لگی۔ دین اسلام کو جس صورت سے ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ وہ غیر معقول اور تقلیدی علمار کو نامعقولیت پر نازش۔ نتیجہ یہ کہ تعلیم یافتہ نوجوان اسلامی عقائد کو رد کرنے لگے اور عقائد میں اسلام سے جدا ہوگئے کچھ رسوم میں شریک رہے اس لئے کہ مرنے جینے میں جماعت کی احتیاج ہے۔ یورپ کے علوم کی تعلیم بڑھتی گئی اور خواص سے گذر کر عوام تک پہونچی۔ اور دین و مذہب مجموعہ لغویات سمجھا جانے لگا۔

تقلیدی لوگ کہیں گے کہ اسلام کا جو مفہوم تم نے بیان کیا وہ نئی بات ہے۔ جو اسلاف کے طریقہ کے خلاف ہے۔ اور تم جو کچھ بتاتے ہو وہ عقلی بات ہے۔ سوائے عقلی استدلال کے اس کی کیا سند ہے۔

جواب

اسلام کا یہ مفہوم نئی بات نہیں۔ دین حق کا یہی مفہوم بعینہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ اور نہ یہ نئی بات ہے معتزلہ اور اصولی شیعہ زمانہ قدیم سے یہی بیان کرتے آئے۔ معتزلہ کے بعد اشاعرہ پیدا ہوئے جنھوں نے تقلیدی مذہب کو مدون کیا۔ معتزلہ اور اصولی شیعہ متفق ہیں کہ اصول دین پر دلیل قطعی سے یقین حاصل کرنا واجب ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دین حق کا اختیار کرنا صرف مستطیع تحقیق پر واجب ہو اس لئے کہ تکلیف بقدر استطاعت ہے۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا

اور اصول دین یعنی توحید و عدل و معاد کی توضیح سے دین کا یہی مفہوم حاصل ہوتا ہے جیسا کہ اوپر واضح کیا۔ مخالف اس مقام پر کہے گا کہ

اس دلیل پر بعض شبہات اور ان کا جواب

سرآمد حکمائے متاخرین عمانوئیل کانٹ نے اس دلیل پر چار شبہات وارد کیے۔

اس فلسفی کی عظمت اور شبہات کی وقت نظر کا حکمائے یورپ پر یہ اثر ہوا کہ ان کی نظر سے یہ دلیل گر گئی۔ حتیٰ کہ حکیم مدقق ہیگل نے ان شبہات کا رد اپنے ایک مشہور جملہ سے کیا۔ وہ یہ ہے۔

"ہر امر معقول حقیقت ہے اور ہر حقیقت امر معقول ہے"

مراد یہ ہے کہ جب ذات کامل کے وجود پر حکم عقلی حاصل ہے تو وہ حقیقت ہے۔

عمانوئیل کے چاروں شبہات کا رد ہم نے کیا ہے اور ان ہی کی بحث سے اس دلیل کا قاطع ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

پہلا شبہ:۔

تم نے اس دلیل میں تصور محض کو جامہ وجود خارجی پہنایا ہے اور یہ جائز نہیں۔

جواب

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ تصور ذہنی کی ماہیت پر نظر کر کے عقل نے حکم کیا کہ وہ موجود خارجی ہے۔

یہ نئی بات ہے اور غلط ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ نہ نئی بات ہے اور نہ غلط ہے اس وجہ سے کہ تم برابر ایسا کرتے ہو اور اس کو صحیح مانتے ہو۔ تصور کی تین قسمیں ہیں۔ ممکن۔ ممتنع اور واجب۔ ہر تصور ممکن پر تم نظر کر کے اس کے وجود خارجی کے متعلق حکم لگاتے ہو کہ وہ موجود ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ نہ ہو اور ہر تصور ...

ہے پہلے آیت سے یہ تنبیہ حاصل ہے کہ اللہ موجود ہے جو دلیل کا مطلوب ہے اور دوسری آیت سے اللہ کی ذات میں ہر صفت کمال کا موجود ہونا حاصل ہے یعنی اللہ ذات کامل ہے۔ یہ صغریٰ ہے۔ ان سے کبریٰ کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ذات کامل ضرور موجود مستقل ہے۔ کیونکہ اگر وہ موجود مستقل نہ ہو تو کامل نہ ہوگی۔ اور یہ خلف ہے۔ اس دلیل کو انگلستان کے ایک متکلم St. Anselm نے پندرہویں صدی عیسوی میں اس طرح پیش کیا :۔

"ذات کامل کا مفہوم ہمارے ذہن میں ہے چونکہ ذاتِ کامل ہر جہت کمال سے متصف ہے لہٰذا ذات کامل مستقل وجود خارجی سے متصف ہے کیونکہ اگر اس کا وجود ذہنی ہو اور مستقل وجود خارجی نہ ہو تو اس کا ناقص ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ اس کے کامل ہونے کے خلاف ہے۔

پس ذات کامل کے مفہوم کے لئے عقل کا حکم حاصل ہے وہ ضرور موجود فی الخارج ہے۔

مزید توضیح

کامل و ناقص کا مفہوم ہم کو حاصل ہے۔ کیونکہ کامل و ناقص دو متضائف تصور ہیں جیسے بڑا چھوٹا۔ علت و معلول۔ ایسے تصور ذہن میں ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان میں کا ایک تصور حاصل ہو اور دوسرا نہ ہو۔ اور ناقص کا تصور ہم کو بداہتہً حاصل ہے کیونکہ ہم چیزوں کو ناقص بھی بتاتے ہیں۔ لہٰذا کامل کا تصور بھی ضرور حاصل ہے اور اس تصور کامل پر حکم عقل حاصل ہے کہ وہ ضرور موجود فی الخارج ہے جیسا کہ اوپر ثابت ہے۔

ہے نہ ایسی شے کے لئے جو ایک جہت سے کامل ہو اور دوسری جہات سے ناقص۔ پس دائرہ کامل اگر موجود ہوگا تو اس میں ایک خاص شکل کا کمال حاصل ہوگا۔ اور کمال شکل کو نقص لازم ہے اس لئے کہ شکل لوازم جسمیت اور مرکب ہے اور مجسم اور مرکب اپنے وجود میں محتاج ہے غیر کی طرف۔

تیسرا شبہ۔ وجود محمول نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب کوئی شے موجود ہو تو اس کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے اور ایسے ہے۔

جواب۔ وجود خارجی محمول ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم ایک خیالی شے پر ہونے یا نہ ہونے کا حکم کرتے ہیں۔ علاوہ بریں محمول کی پانچ قسمیں ہیں۔ جنس۔ نوع۔ فصل۔ عرض عام اور خاصہ۔

اور وجود خارجی ایک جنس ہے جو سب سے اعلیٰ جنس کی دو قسموں۔ وجود ذہنی اور وجود خارجی میں سے ایک قسم ہے۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ اتیبر موجود ہے۔ یعنی تصور اتیبر وجود خارجی رکھتا ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں خدا موجود ہے عرش موجود ہے۔

چوتھا شبہ۔ علم صحیح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں ایک امر حسی دوسرا امر عقلی پس خدا چونکہ حسی نہیں اس کا علم صحیح حاصل نہیں ہو سکتا۔

جواب۔ یہ نظریہ کہ علم صحیح کے لئے امر حسی ضروری ہے۔ غلط ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ اس نظریہ کی صحت کا دعویٰ ہے اور خود اس میں کوئی امر حسی نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض خیالی بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کانٹ کے شبہات اور ان کا رد اس دلیل کی صحت اور استقلال سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

سب سے پہلے افلاطون الٰہی نے اس دلیل کی طرف اشارہ کیا اس کے

ممتنع (محال) کی ماہیت پر نظر کر کے تم اس کے وجود خارجی کے متعلق حکم لگاتے ہو کہ وہ موجود خارجی نہیں ہو سکتا۔

پس جب تصور کی دو قسموں ممکن اور ممتنع پر صرف ماہیت تصور سے ان کے وجود خارجی کے متعلق صحیح حکم حاصل ہوتا ہے تو تیسری قسم واجب کے لئے کون امر مانع ہے کہ اس کے تصور سے اس کے وجود پر حکم نہ لگایا جائے۔

بنائے حکم تینوں میں ایک ہی ہے یعنی ماہیت تصور پر نظر کرنا پس واجب الوجود وہ ہے جس کی ماہیت سے وجود خارجی لازم آتا ہے اس کی ماہیت مستلزم وجود ہے۔

ممکن الوجود وہ ہے جس کی ذات نہ مانع وجود ہو نہ مستلزم وجود ممتنع الوجود وہ ہے جس کی ماہیت مانع وجود ہے۔

جو شئے خیال میں آ سکے وہ تصور ہے

اور وہ تصور یا تو ایسا ہوگا کہ وجود خارجی کو قبول کرے یا ایسا ہوگا کہ وجود خارجی قبول نہ کرے (یعنی ممتنع الوجود) اور جو تصور وجود کو قبول کر سکتا ہے وہ یا تو بالضرور موجود ہے (یعنی واجب) یا وہ وجود قبول کر سکتا ہے (یعنی ممکن)

پس تصور کی یہ تقسیم عقلی ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شبہ:۔

کمال کو وجود لازم نہیں۔ مثلاً کامل دائرہ کا تصور ہے اس کا موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔

جواب:۔ ہماری دلیل کمال مطلق کے لیئے وجود لازم ثابت کرتی

ہے وہ جسم ہے (یہی جسم کی تعریف ہے) اور چونکہ ادراک حسی کیلئے جسم وجسمانی ہونا ضروری ہے۔ لہذا واجب الوجود کا حسی ادراک محال ہے۔ یعنی وہ الغیب ہے بمعنی غائب علی الاطلاق۔

دفعہ ۱۷۔ عالم نظام ہے۔

نظام وہ مجموعہ موجودات ہے جس کے اجزاء میں باہم تاثیر و تاثر ہو اور ہر تاثیر ایک وضع معین پر واقع ہو۔ انسان کو جب اس وضع معین کا علم ہو جاتا ہے تو وہ عالم پر تصرف کرتا ہے اور ترقی علم کے ساتھ ہماری تسخیر عالم بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ مسلم ہے کہ جس قدر قوانین فطرت کا علم زیادہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر انسان کا تصرف فطرت پر بڑھتا جا رہا ہے۔ اسی تسخیر عالم کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السماوات وما فی الارض	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے مسخر کیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

اگر عالم نظام نہ ہو تو اس پر انسان کا تصرف ممکن نہ ہو۔

عالم کے نظام ہونے کی ضرورت عالم کے نظام ہونے سے ہر تاثیر کی ایک معین وضع ہے۔ ہر معین وضع کا نام قانون ہے جو عالم میں نافذ ہیں صرف ان قوانین فطرت کی ہمہ گیری سے انسان کی زندگی اس دنیا میں ممکن ہوئی۔ ماحول پر ہمارا تصرف انہیں قوانین پر موقوف ہے۔

اگر یہ قانون فطرت نہ ہو کہ بے سہارے چیز زمین کی طرف آئے بلکہ ہر سمت میں ان کا اتفاقی فرار ہو تو درخت سے پھل حاصل ہونا دشوار ہو۔

نزدیک "خیر مطلق" وجود میں سب سے اعلیٰ ہے اس لئے بالضرورت موجود ہے

اکتساب علم میں طریقہ سب کا تحقیق ہے خواہ حکماء و فلاسفہ ہوں خواہ انبیا و رسل و مومنین۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک حکیم لقمان کا ذکر ہے۔ اور اس کے نتائج فکر کو قرآن اس لئے بیان کرتا ہے کہ دین حق کا حصول عقل و تفکر سے ہے

دفعہ ۱۵۔ مراتب وجود

موجود وہ ہے جو مصدر تاثیر ہو اس لئے موجود جس قدر زیادہ تاثیر یا تصرف کرے اسی قدر وہ مرتبۂ وجود میں اعلیٰ ہے۔

ادنیٰ ترین وجود جمادات کا ہے کہ ان کا تصرف خفیف ترین ہے اور ان کا وجود و عدم ان کی ذات کے لئے مساوی ہے۔ دوسرا درجہ نباتات اور ادنیٰ جانوروں کا ہے۔ تصرف ان کا زیادہ ہے۔ ماحول سے جذب غذا کرتے ہیں

تیسرا درجہ اعلیٰ حیوانات کا ہے جو اپنے جسم میں حرکت کی ابتدا کرتے ہیں۔

چوتھا درجہ انسان کا ہے جو اپنے عقل و علم سے فطرت پر تصرف عظیم کرتا ہے

دفعہ ۱۶۔ برہان علم الوجود

تمام موجودات عالم ممکن الوجود ہیں اس لئے کہ ان میں سے کسی کا تصور مستلزم وجود نہیں۔

اور جو ممکن ہے اس کو اپنے وجود میں غیر کی احتیاج ہے اور وہ غیر سوائے واجب کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا واجب الوجود موجود ہے۔

واجب الوجود جسم نہیں ہے اور جسمانیات سے منزہ ہے یعنی جسم کی صفات اس میں نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ جسم مرکب ہے اور مرکب ممکن الوجود ہے چونکہ واجب جسم نہیں ہے اس لئے جگہ نہیں گھیرتا یعنی کسی جگہ میں نہیں ہے کیونکہ جو جگہ گھیرتا

ان کے احوال ایک دوسرے سے متالم اور موافق ہیں۔ پس کسی امر کے حق ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ دیگر حقائق سے متالم و موافق ہو اس طرح حقائق کا انکشاف ہے۔

تصور کلی کی صحت۔ چونکہ موجودات عالم کے جو تصورات ہم کو حاصل ہیں وہ ان کی حقیقت حال کے مطابق ہیں۔ لہذا ہر نوع کی مختلف افراد کا جزو مشترک جو تصور کلی ہے وہ بھی ان کی حقیقت حال کے مطابق ہے کیونکہ وہ انھیں افراد سے حاصل ہوا ہے۔ مثلاً متعدد نارنگیاں دیکھیں۔ ان افراد کا جزو مشترک نارنگی کا تصور کلی ہے۔ چونکہ وہ مشترک جز حقیقی ہے یہ تصور کلی بھی مطابق ہے۔

نوع کا تصور بذریعہ عقل کے تجرید ذہنی سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی افراد سے جزو مشترک کو عقل ممیز کر لیتی ہے۔ اس لیے تصور کلی کی حقیقت حال پر عقل جو حکم کرتی ہے وہ اس نوع کی ہر فرد کا حقیقت حال ہے۔ پس نظام عالم کا چھٹا فائدہ یہ ہے کہ ہم کو تصور کلی اور تصدیقات کلیہ صحت کے ساتھ حاصل ہیں۔ یہ حکم اس نوع کی تمام افراد کے لئے صادق ہوتا ہے عام اس سے کہ وہ ماضی ہوں یا مستقبل، مشہود ہوں یا غیر مشہود کیونکہ جس شئے میں یہ جز و مشترک ہوگا اس نوع میں داخل ہیں۔

کلی تصورات و تصدیقات کلیہ مفاہیم عقلیہ ہیں۔ اس لئے کہ وہ باعانت عقل حاصل ہیں۔ اور چونکہ یہ مفاہیم عقلیہ حقیقت حال کے مطابق ہیں اس لئے عالم معقول میں اور عالم محسوس میں مطابقت ہے اور جس طرح عالم محسوس ایک نظام ہے عالم معقول بھی ایک نظام ہے اس لئے حقائق عقلیہ باہم متالم اور موافق ہیں۔ اور بعض حقائق عقلیہ دیگر حقائق عقلیہ کی خبر دیتے ہیں۔

اگر یہ قانون فطرت نہ ہو کہ دانہ زمین میں بونے سے مناسب رطوبت و حرارت پاکر درخت ہو جائے۔ تو کاشت محال ہو۔ اگر یہ قانون فطرت نہ ہو کہ دھاردار آلہ سے جسم شگافتہ ہو تو نہ کاشت ہو سکے نہ مکان بن سکے نہ اور چیزیں بن سکیں۔ اگر خطرات واقع ہونے سے پہلے معین علامات ظاہر نہ ہوں تو زندگی دشوار ہو جائے۔

اس لئے تمام حوادث عالم سلسلہ علت و معلول سے وابستہ ہیں۔
پس خداوند عالم نے عالم کو نظام اس لئے بنایا کہ انسان زندگی بسر کر سکے۔
دوسری ضرورت۔ یہ کہ وہ ہمارے علم اور معرفت اور تکمیل کا وسیلہ ہو۔ چنانچہ اس کے نظام ہونے سے ہم ایک موجود کی حقیقت حال سے دوسرے موجود کی حقیقت حال تک پہونچتے ہیں۔ اس طرح ہم پر علم کا باب کھولا ہے
تیسرا فائدہ۔ توثیق علم (یعنی علم کی صحت ثابت ہونا) چونکہ جب ہم ایک سیارہ کے مشاہدہ حال سے دوسرے نامعلوم سیارہ کی حقیقت حال تک پہونچتے ہیں جیسے ایک ہیئت داں نے یورنیس کے مشاہدہ سے نیپچون کا وجود اور حال معلوم کر لیا اور بعد کو اس کا مشاہدہ ہوا تو ثابت ہوا کہ ہمارا علم عقلی درست تھا۔ اور موجودات کا جو علم ہم کو حاصل ہے۔ وہ ان کی حقیقت حال کے مطابق ہے۔

نوٹ۔ توثیق علم کے مزید تین دلائل ہم آگے بیان کریں گے۔

چوتھا فائدہ - توثیق استدلال۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ نظام کے سبب ہم ایک موجود کے حال سے دوسرے کے وجود اور حال سے خبر پاتے ہیں۔ کیونکہ ایک شے دوسرے سے متاثر ہو وہ تاثیر غیر کے اثر کی خبر دیتی ہے۔ پس علامات سے معلوم تک اور معلول سے علت تک رسائی ہے۔

پانچواں فائدہ۔ چونکہ تمام موجودات ایک دوسرے کی تاثیر سے متاثر ہیں

تک زندہ رہ کر علمی اور اخلاقی ترقی کرے اور اس طرح بہتر درجہ حیات کا اہل اور مستحق ہو جائے۔ اور جو تدبیر مختلف اغراض کی جامع ہو کر غرض واحد کی طرف راجع ہو ایسے مدبر کا معلول ہے جس کے علم میں وہ اغراض پہلے سے ہوں۔ ورنہ اس تدبر کا وجود محال ہو گا۔ اس لئے نظام عالم سے ایک قدیر و علیم ناظم کا وجود ثابت ہے۔ نظام عالم سے اس دلیل کے قائم ہونے پر ذیل کی آیت میں اشارہ ہے۔

وسخر لکم ما فی السماوات و الارض جمیعًا منہ	اور مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کا سب۔
ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون	اس میں نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو تفکر کرتے ہیں۔

ہر حقیقت امر معقول ہے۔ جیسا کہ اوپر ثابت ہوا کہ نظام ہونے کے سبب ہر موجود کے حقیقت حال پر دوسرے موجودات سے دلیل آتی ہے اس لئے کہ وہ باہم تاثیر و تاثر سے مربوط ہیں۔ لہٰذا ہر حقیقت حال دلیل سے مبرہن ہے اور امر معقول ہے۔

ہر امر معقول حقیقت ہے۔ جس امر مجہول کے حقیقت حال پر دوسرے موجودات کی حقیقت حال سے دلیل قائم ہو کر اس کو امر معقول بناتی ہے اس کا موجود ہونا یقینی ہے۔ یعنی ہر امر معقول حقیقت ہے۔

وجود باری کا انکار کرنا شرک ہے یعنی ملحدین مشرک ہیں۔ اس لئے کہ منکر وجود باری عالم کو قدیم موجود بالذات مانتا ہے۔ پس وہ عالم کو واجب الوجود جانتا ہے۔ لیکن وجوب وجود اللہ کی صفات ذاتیہ میں سے ہے۔ اور اللہ کی صفات ذاتیہ میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے

یہ وجہ ہے کہ ہر حقیقت عقلی پر (اگر وہ نظری ہے) دلیل قائم ہو سکتی ہے۔ اور اس کا دیگر حقائق سے تسالم اور موافق ہونا بھی اس کی دلیل ہے

باطل اور غلط کا وجود غلط کا اطلاق صرف تصدیق پر ہوتا ہے یعنی جب ہم کسی موجود کی حقیقت حال کے خلاف کوئی بات کہتے ہیں تو ہمارا وہ خیال غلط ہوتا ہے۔ پس غلط و باطل کا وجود صرف ذہنی ہے۔

ابطال باطل کی کیفیت۔ چونکہ باطل ایسا مفہوم ہے جو حقیقت کے مطابق نہیں اس لئے دیگر حقائق اس کے معارض و مخالف ہوتے ہیں اس طرح وہ باطل کی نفی کرتے ہیں۔ اس طرح ہم کو ابطال باطل کا ایک وسیلہ حاصل ہوتا ہے۔

دفعہ ۱۴۔ برہان نظام۔

۱۔ عالم کے نظام ہونے سے انسان فطرت پر تصرف کرتا ہے اور زندگی بسر کر سکتا ہے۔

۲۔ اسی نظام کی بدولت وہ تجربہ و علم حاصل کرتا ہے۔

۳۔ یہی نظام انسان کو اشیاء حاضر کے علم سے موثر غایب کی طرف کھینچتا ہے۔

۴۔ یہی نظام اس کے علم کی صحت فراہم کرتا ہے۔

۵۔ اسی نظام کے سبب انسان علامات کے علم سے خطرات سے بچتا ہے۔

اور یہ سب اغراض صرف ایک غرض کے تحت ہیں کہ انسان ایک قلیل عرصہ

قل لو کان معہ الھتہ کما یقولون	کہدو کہ اگر اس (اللہ) کے ساتھ کئی معبود ہوتے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو وہ (معبود) ضرور اختیار کرتے۔ راہ مالک
اذا لا تبتغوا الی ذی العرش سبیلا	عرش (حکومت) کی یعنی اسکی رضا و عبادت اختیار کرتے۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ مشرک ان معبودوں کے لیے انسان سے بدرجہا زیادہ علم فرض کرتے ہیں، پس ان کو معرفت الہٰ حاصل ہوتی اور وہ اسی کے رضا پر چلتے اور اس کے تابع ہوتے۔

سبحانہ تعالیٰ عما یقولون علوا کبیرا	اس کی ذات جو اعلیٰ اور برتر ہے پاک ہے اس سے جو وہ کہتے ہیں (کہ اس کے وزیر اور مشیر ہیں)

نوٹ۔ مفسرین اسلام ان آیات کے معنی ہرگز نہ سمجھ سکے۔

عالم ہمہ تن انسان کا سامان تربیت ہے

تمام یعنی انسان کا ماحول جو ہمارے علم میں ہے اور جو ہماری ذات پر موثر ہے اپنی تمام اشیاء اور اعمال سے انسان کی تربیت اور تکمیل کا سامان اور وسیلہ ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے۔ اس ماحول میں نفسیاتی اور معاشرتی ماحول بھی شامل ہے یعنی عالم جمادات و نباتات کے علاوہ نظام معاشرت اس کے رسوم و رواج نفس میں ضمیر اور اس کے احکام جذبات و خواہشات۔ اس کے تصورات سب ماحول میں داخل ہیں۔

اگر اس ماحول کا ہر جز اور تمام اعمال فطرت انسان کی اس غرض حیات کی طرف راجع ہے کہ وہ علمی اور عملی ترقی کرے تو عالم میں ہر موجود کی توجیہہ اس

بطلان شرک کے دلائل۔ جو لوگ عالم پر دو یا زیادہ ہستیوں کو متصرف مانتے ہیں وہ مشرک ہیں اس لئے کہ یہ قادر مطلق ہونے کا انکار ہے قادر مطلق کا عالم پر متصرف بالاستقلال ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی اس کا مددگار ہو تو وہ قادر مطلق نہیں۔

پس دوسرا معبود بھی ماننا عالم مطلق یا قادر مطلق کا انکار ہے اب یا تو دوسرا معبود بھی قادر مطلق ہے جو محال ہے اس لئے کہ ذات کامل کا تعدد محال ہے۔ وجود عالم کے لئے ایک ذات کامل کا علت مستقلہ ہونا ثابت ہے۔ اس لئے دوسری ذات کامل کا وجود ثابت نہیں۔

اب یا تو صرف ایسی ہستیوں یا معبودوں کا اعتقاد کیا جائے جو علم و قدرت میں کامل نہیں یا ایک ذات کامل (اللہ) کے ساتھ ایک یا زیادہ ناقص العلم اور ناقص القدرت ہستیوں کا اعتقاد کیا جائے تو یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ اور ان کے بطلان کی دلائل کی طرف ذیل کی آیات میں اشارات ہیں۔

انبیاء - ۲ -

لو کان فیہما الھۃ	اگر ان دونوں (آسمان و زمین) میں
الا اللہ	کئی معبود ہوں مگر اللہ نہ ہو۔ تو وہ
لفسدتا	دونوں فاسد ہو جائیں (یعنی نظام باقی نہ رہتا)

اس آیت میں شرک کی صورت اول مفروض ہے یعنی کئی ناقص العلم اور ناقص القدرت معبود کہ ان میں بوجہ نقص اختلاف رائے ہونا ضرور ہے اور عالم میں فساد لازم ہے لیکن عالم نظام ہے۔ لہذا ایسے معبود نہیں ہیں۔

دوسری صورت۔ اللہ کے ساتھ کئی ناقص معبود ہونا۔

بنی اسرائیل - ۵ -

من الدھر لم یکن شیئاً	زمانہ دہر سے (یعنی حیات
مذکورا	چند روزہ دی) اس سے پہلے
انا خلقنا الانسان من	اس کا ذکر بھی نہ تھا۔ ہم نے بنایا
نطفۃ	انسان کو امتزاج کرنے والے
امشاج۔ نبتلیہ۔ فجعلناہ	نطفہ سے تاکہ ہم ابتلا میں ڈالیں
	اس کو۔ پس بنایا ہم نے اس کو سمیع

وبصیر

اس آیت نے باوجود اختصار کے کثیر مطالب کا احاطہ کیا ہے۔

۱۔ انسان کی حیات الی الدہر ہے وہ فنا نہ ہوگا

۲۔ موجودہ حیات اس ابدی حیات کا ایک جزو قلیل ہے جو انسان کو عطا ہوا

۳۔ تخلیق انسان سے پہلے جن و ملائکہ موجود تھے لیکن کسی کو اس کے پیدا ہونے کی خبر نہ تھی اس لئے انسان کا کوئی ذکر بھی نہ تھا۔

۴۔ انسان کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا جو اپنی بقا میں خارجی مادہ سے امتزاج چاہتا ہے اس لئے ہمیشہ یہ احتیاج اس کے ساتھ قائم ہے اور یہ احتیاج محرک عمل ہے اور انسان سے عمل کرانا غرض آفرینش میں شامل ہے۔

۵۔ تاکہ ہم اس کو ابتلا میں ڈالیں۔ احتیاج سے تکالیف و آلام اور خواہشات پیدا ہوتیں اور وہ اسباب ابتلا ہیں۔

۶۔ اس ابتلا کے لیے ضروری ہوا کہ اس کو حواس عطا کئے جائیں تاکہ وہ اپنے ماحول میں مایحتاج کا موجود ہونا معلوم کر سکے یا ان کو تلاش کر سکے۔

۷۔ یہاں یہ ذکر نہیں کہ انسان کو عقل عطا کی۔ کیونکہ عقل انسان کی ماہیت میں داخل ہے (۲) مجسم ہو کر انسان کا زندہ رہنا اور عمل کرنا اسی وقت ممکن تھا کہ وہ عظیم کرہ پر ساکن ہو جس میں اس کی تربیت کا سامان موجود ہو۔ اگر وہ خلا میں

نظریہ سے ہوجائے گی اور اس نظریہ کی صحت پر استقرائی دلیل قائم ہوجائے گی۔ چونکہ اور کوئی نظریہ ایسا نہیں جو تمام مظاہر فطرت کی توجیہہ کرسکے اور اس نظریہ پر پوری توجیہہ حاصل ہے۔ تو جدید حکماء کے مذاق پر اس کی صحت کا یہ بہترین ثبوت ہوگا اور عالم کے ہر جز کا اسی غرض کی طرف راجع ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا حکیم و علیم و قدیر صانع ہے۔

قرآن مجید اس دلیل کے دونوں نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے اس نظریہ کی تفصیل یہ ہے۔

بہتر درجہ حیات کی اہلیت اور استحقاق پیدا کرنے کو انسان سے عمل صحیح مطلوب ہے جس سے علمی اور اخلاقی ترقی ہوتی ہے۔ اس ترقی کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے کے لئے عمل صحیح کے مزاحم پیدا کر دیے گئے ہیں وہ ایک طرف تو ہماری خواہشات اور جذبات ہیں دوسری طرف آلام و مصائب کا ورود ہے۔ باوجود ان کے عمل صحیح پر قیام و ثبات انسان کی قدر و منزلت زیادہ کرتا ہے۔ ایسے ابتلا کے ساتھ ترقی کی رفتار سریع ہے۔ اس لئے تھوڑا عرصہ حیات اس کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے ابتلا کے زمانہ کو چند روزہ کہا ہے اور موت کے اسباب پیدا کر دیے ہیں۔

۱۔ احتیاج اور اس سے خواہشات پیدا کرنے کو انسان کو ایسا جسم دیا ہے جس کو اپنی بقا اور اصلاح میں خارجی مادہ سے امتزاج ضروری ہے اور خارج سے مایحتاج حاصل کرنے میں عمل کرنا پڑتا ہے اور ماحول سے اتصال اور اس پر قابو پانے کو حواس عطا کئے اور اس کے ابتلا کے لیے دوران عالم سے ایک قلیل زمانہ حیات اس کو دیا۔

ان تمام مطالب کا بیان ذیل کی آیات میں ہے۔

سورہ دہر

هل اتی علی الانسان حین — بیشک آیا انسان پر ایک عرصہ قلیل

۶۔ اگر سطح ارض پر رات و دن کا تبدل نہ ہو تو وہ حصہ جو آفتاب کے سامنے رہے مسلسل وصول حرارت سے اس قدر گرم ہو جائے کہ ہر ذی حیات کو جلا دے۔ اور وہ حصہ جس پر مسلسل رات رہے شدت برودت اور روشنی نہ ہونے سے نباتات و حیوانات کو فنا کر دے۔ اس لئے دن و رات کا تبدل وہ تدبر ہے جو زمین پر انسان کی بقا کا سبب ہے۔

ان فی اختلاف الیل والنہار	بیشک دن و رات کے تبدل میں
وماخلق اللہ فی السموات و	اور جو کچھ اللہ نے خلق کیا ہے زمین و
الارض لآیات لقوم یعقلون	آسمانوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں
	کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں

۷۔ زمین کے محور کا اس کے مدار کی سطح پر عمودی نہ ہونا بلکہ ترچھا ہونا اور زمین کا آفتاب کے گرد گردش کرنا اختلاف موسم کا سبب ہے اور اختلاف موسم انسان کی زندگی کے لیے متعدد وجوہ سے مصلح ہے۔ پس یہ تدبر بھی اس ہی غرض کی طرف راجع ہے کہ انسان کی اس حیات میں تربیت و تکمیل ہو۔ چنانچہ ذیل کی آیت سے پہلے اختلاف لیل و نہار کا ذکر ہے اس کے بعد ہی یہ آیت ہے جس میں آفتاب کے گرد زمین کا طواف اور اس سے زمین کی طرف (پہلو) روشنی کا کم و بیش ہونا مذکور ہے۔

افلا یرون انا نأتی الارض	کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم لاتے
ننقصہا من اطرافہا	ہیں زمین کو کمی کرتے ہوئے اس کی
افہم الغالبون	اطراف (پہلوؤں) میں۔ تو کیا وہ
	اس پر قادر ہیں۔

زمین کو لاتے ہیں۔ یعنی زمین کو حرکت دیتے ہیں اور وہ اس طرح

پیدا کر دیا جاتا تو نہ حرکت کر سکتا نہ عمل۔ اس کا بیان یہ ہے

اللہ الذی جعل لکم الارض قرارا۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے (کرۂ) ارض کو تمہارا جائے قرار بنایا۔

الم نجعل الارض کفاتا احیاء و امواتا۔ کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو جگہ کرنے کی جگہ زندوں و مردوں کے لیے

۳۔ انسان کا عمل و تربیت اس پر موقوف ہے کہ وہ اپنے ماحول پر تصرف کر سکے۔ اور تصرف بغیر قوانین فطرت ناممکن ہے اس لیے عالم کو قوانین کا مسخر کیا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ اور مسخر کیا ہم نے تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کا سب

حج۔ الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض

لقمان۔ الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السماوات وما فی الارض

۴۔ انسان اپنا مایحتاج فطرت سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اس کا مشاہدہ کرتا ہے اور یہ حصول علم کا ذریعہ ہے۔

ان فی السماوات والارض لایات للمومنین۔ آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں اہل یقین کے لئے۔

۵۔ کشش ثقل اور حرکت دوری (طوافی) سے سیارات و اقمار اور ثوابت کو ایک معین مدار پر قائم کیا۔ اس طرح آفتاب و قمر کے نور و حرارت کو ایسے مدارج پر قائم کیا جو ذی حیات کے لئے ضروری ہے۔

وسخر لکم الشمس والقمر دائبین اور مسخر کیا تمہارے لئے آفتاب اور ماہ کو حرکت کرتے ہوئے

ان شکنوں کے پڑ جانے سے غلاف زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوا۔ جیسے لوہے کی چادر میں شکنیں ڈال کر اس کو مضبوط کر لیتے ہیں اور ایسی ہی چادریں (Corrugated sheets) چھت پر ڈالتے ہیں اور بطور دیوار کے کھڑی بھی کر لیتے ہیں۔ بغیر اس کے چادر کھڑی نہ ہو سکے بلکہ مڑ جائے۔ اس طرح زمین کی سطح مستحکم ہوئی اور زلزلوں کی زیادہ مزاحمت کرنے لگی۔

الم نجعل الارض مھادا ۔ کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو فرش
والجبال اوتادا اور پہاڑوں کو میخیں۔

جس طرح میخوں سے کسی شے کو مضبوط باندھتے ہیں اسی طرح سطح ارض کو پہاڑوں سے مضبوط کیا ہے۔ صورت یہ ہے کہ بطن ارض کے سکڑنے سے اور اجزائے غلاف کے نیچے گرنے سے برابر زلزلے پیدا ہوتے رہتے ہیں چنانچہ رصدگاہوں میں مقیاس الزلزل (Seismograph) روزانہ زلزلوں کا احساس کرتا ہے لیکن ساکنان ارض کو ایسا ہی شدید زلزلہ ہو تو محسوس ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ غلاف زمین مستحکم ہو کر زلزلوں کی مزاحمت کرتا ہے۔ یہ استحکام ارضی ترچھی شکنوں سے ہے جو حدب اور پہاڑ کی صورت میں نمایاں ہیں

۱۰۔ اجرام سماوی اپنی ذات میں خود مسکن مخلوقات ہیں لیکن ان کے وجود سے انسان کو بھی گوناگوں فوائد ہیں۔ اول۔ آفتاب و ماہتاب کی ظاہری حرکت سے جو بروج فلکی کے معین ہونے سے محسوس ہے۔ سال و ماہ کا تعین ہوا اور دن مشخص ہوا اور اس طرح حساب و تاریخ اور معاملات میں ضبط پیدا ہوا۔ یہ امور ایک طرف تو ترقی و تمدن کا وسیلہ ہوئے دوسری طرف انسان کی ترقی علم کا ذریعہ بنے۔

کہ اس کے اطراف روشن یا تاریک میں کمی ہوتی جاتی ہے چنانچہ معلوم ہے کہ زمین کا روشن پہلو نصف کرۂ شمالی میں جاڑوں میں کم ہو جاتا ہے جس سے دن چھوٹا ہو جاتا ہے اور گرمی میں بڑا ہو جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ پہلو مسلسل متغیر ہوتے رہتے ہیں اس لئے ہر تغیر سے ایک نیا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ زمین جب کرۂ آتشیں کی صورت سے رفتہ رفتہ سرد ہو کر ایک پتھر کا کرہ بن گئی تو اب اس کی سطح توڑ کر اور ریزہ ریزہ کر کے مٹی پیدا کرنے کا اہتمام ہوا تاکہ نباتات آ گئیں اور کاشت ہو سکے۔ اس کا اوپر کا حصہ یعنی سطحی غلاف پہلے سرد ہو کر سکڑا اور چونکہ اندر کا حصہ گرم رہا وہ اپنے حجم پر باقی رہا نتیجہ یہ ہوا کہ اوپر کا غلاف پھیلا اور جا بجا سے پھٹ گیا۔ کھنچنے اور پھیلنے سے جو غلاف نرم پڑا۔ اب بارش و برف وپلے نے اس کو توڑا غلاف کے پھٹنے سے وادیاں پہاڑ و درے پیدا ہوئے۔ اس کا بیان یہ ہے۔

والقی فی الارض رواسی	اور ڈالیں اس نے زمین میں
ان تمید بکم۔	اونچے مقامات (یا چوٹیاں پہاڑ کی) تاکہ وہ نرم ہو تمہارے لئے
وانھار وسبلا لعلکم	اور (ڈالے) دریا و راستے تاکہ
تھتدون	تم راہ پاؤ۔

یہ امور سامان تربیت کی فراہمی ہیں

۹۔ ایک زمانہ گزرنے کے بعد زمین کا اندر کا کچھ حصہ بھی ٹھنڈا ہوا اب وہ چھوٹا پڑا اور غلاف بڑا ہو چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غلاف میں شکنیں پڑیں جس طرح سیب کا گودا سوکھ جانے سے چھلکے میں شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ اس طرح بڑے بڑے پہاڑ و درے و وادیاں پیدا ہوئیں

عورت، و مرد کو اس طرح بنایا کہ ایک کو بغیر دوسرے کی تسکین و اطمینان نہ ہو۔

ومن ایاتہ ان خلق لکم	اور اس کی نشانیوں میں یہ ہے کہ تمہارے
من انفسکم ازواجا لتسکنوا	لئے تمہارے ہی نفوس میں سے ازواج
الیھا وجعل بینکم مودۃ و	پیدا کیں کہ تم ان سے تسکین پاؤ اور
رحمۃ۔	تمہارے درمیان محبت اور رحم
	پیدا کیا۔

۱۳۔ انسان تولید نسل سے پیدا ہوتا ہے پھر بھی اگر سب مرد ایک صورت کے اور سب عورتیں ایک صورت کی ہوں تو ایک دوسرے کی شناخت نہ ہو سکے اور نظام معاشرت درہم برہم ہو جائے اس لئے مماثلت نوعیہ کے ساتھ افراد میں وضع اور آواز کا فرق رکھا اور ہر فرد کو جداجدا مشخص رکھا۔

ومن ایاتہ خلق السماوات	اور اس کی نشانیوں میں آسمانوں اور
والارض واختلاف الوانکم	زمین کی خلقت ہے
والسنتکم ان فی ذالک لایات	اور تمہاری اوضاع اور آوازوں
للعالمین ومن الناس والدواب	کا اختلاف ہے
والانعام مختلف الوانہ	ان میں نشانیاں ہیں اہل عالم کے لئے
	اور انسانوں اور جانوروں، چوپایوں
	میں مختلف وضع کے ہیں

اگر چوپائے مختلف نہ ہوں تو انسان کو اپنے مویشی اور غیر کے مویشی میں امتیاز نہ ہو سکے۔

نوٹ۔ اس تفسیر کے آئندہ جلد میں سماوات کی حقیقت سے بحث ہے۔

۱۴۔ جماعت میں زندگی بسر کرنے کو اور ترقیِ علم کے لیے ضروری تھا کہ انسان ایک دوسرے پر اپنا خیال ظاہر کر سکے۔ اس لئے اس کو گویائی عطا کی۔

خلق الانسان وعلمہ البیان	اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان

وھو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب۔ — اور وہ وہی ہے جس نے بنایا آفتاب کو ضیا اور ماہتاب کو نور اور اس کی منازل مقرر کیں تاکہ تم سالوں کا شمار اور حساب کر سکو

الرحمٰن۔ والشمس والقمر بحسبان۔ اور آفتاب اور ماہتاب حساب کے لئے

فلکیات کا دوسرا فائدہ۔ ثوابت کا مقام بلحاظ ایک دوسرے کے بظاہر معین ہے۔ اور انھیں کی وجہ سے آفتاب اور ماہتاب کی حرکت مشخص ہوئی جس سے سال و ماہ کا اندازہ ہوا۔

فلکیات کا تیسرا فائدہ۔ آفتاب و ثوابت سے زمین کو حرارت و نور و نشو برقیہ حاصل ہیں جو ذریعہ حیات و تربیت ہیں۔

فلکیات کا چوتھا فائدہ۔ ثوابت و سیارے و قمر زینت آسمان کا سبب ہیں اگر برسات کی اندھیری رات سے مقابلہ کرو تو ان کا حسن ظاہر ہے اس طرح انسان کے ماحول کو خوش منظر بنایا ہے۔

انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب — ہم نے زینت دی آسمان دنیا کو کواکب کی زینت سے

۱۱۔ حفاظت نفس کے لئے ضروری تھا کہ مضرات کو انسان دفع کرے اور ان کا علم ہو اس لئے مضرات سے نفس کو تکلیف و الم پہونچنا مقدر کیا۔

۱۲۔ ایک نفس واحد سے دیگر انسانوں کا پیدا ہونا اس لئے معین فرمایا کہ ایک دوسرے کی تربیت اور اعانت کرے اور ایک کو دوسرے کا علم ہو سکے۔ اس طرح وہ کار خیر کریں۔ ان میں باہم محبت پیدا کر کے ایک کو دوسرے کے لئے نعمت بنا دیا اور تولید مثل جاری رکھنے کو شہوات صنفی کو ذی پیدا کیا کہ انسان بار عیال سے گھبرا کر تولید سے باز نہ رہے۔ اس لئے

کرنا سکھایا۔

۱۵- کرہ ہوا جس کو قرآن مجید میں سماء دنیا فرمایا ہے تنفس کا سامان ہے ایصال آواز کا سبب ہے اور اپنی حرکات سے بارش کا سبب ہے۔ سمندر کا پانی بخارات بن کر کرہ ہوا سے مخلوط ہوتا ہے خشکی کے حصے جو سطح سمندر سے بلند ہیں وہاں پہنچ کر بلند تر ہو کر پھیلتے ہیں اس طرح سرد ہوتے ہیں اور درجہ برق کی مساعدت سے بادل بن کر برستے ہیں

الم تر ان اللہ یزجی سحابا	کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ چلاتا ہے
ثم یؤلف بینہ ثم یجعلہ رکاما	بادلوں کو پھر لاتا ہے ان کو پھر ان
فتری الودق یخرج من	کو ڈھیر بناتا ہے پھر دیکھتا ہے تو
خلالہ	بارش کو اس کے بیچ سے نکلتے ہوئے

۱۶- ہوا حیوانات کے سانس لینے سے خراب ہوتی رہتی ہے کیونکہ ہوا کا نافع جز آکسیجن صرف ہوتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ حیوانات کی سانس سے نکلتا رہتا ہے جو حیوانات کے لئے مضر ہے۔ اگر یہ صورت جاری رہے اور تلافی نہ ہو تو تمام کرہ ہوا کا آکسیجن صرف ہو جائے اور تمام حیوانات و انسان ہلاک ہو جائیں لیکن کاربن ڈائی آکسائیڈ نباتات کے لیے ضروری ہے۔ ان میں یہ طاقت ہے کہ وہ ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کرتے ہیں اور ان کا سبز مادہ (کلوروفیل) روشنی کی مدد سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تجزیہ کرتا ہے اس کا کاربن نباتات کا جزو بدن ہوتا ہے اور وہ آکسیجن کو اس سے جدا کر کے کرہ ہوا میں واپس دیتی ہیں۔ پس اگر دنیا میں صرف حیوانات یا صرف نباتات ہوں تو بالآخر وہ فنا ہو جائیں نباتات و حیوانات دونوں ایک دوسرے کے وجود کے لیے ضروری ہیں۔ اس تدبیر سے خداوند عالم نے دونوں کا وجود قائم کیا ہے۔

وما انزل اللہ من السماء	اور جو اللہ نے آسمان سے پانی اتارا

۲۱۔ ذی حیات کا وجود پانی میں ہوا جیسا کہ اہل ارتقا کا دعویٰ ہے پانی انسان کی حیات کو ضروری۔ اسکی غذا کا بڑا جز۔ اس کے جسم کا ۳/۴ حصہ پانی ہے اور پانی ہی سے نباتات کا ظہور رہے جو انسان کی غذا ہے اسی اہمیت کی طرف ذیل کی آیت میں اشارہ ہے۔

هوالذی خلق من الماء بشرا	وہی ہے جس نے بنایا بشر کو پانی سے۔

علوم طبیعی کی تحقیق بھی پانی کو کرۂ ارض پر نہایت اہم اور مفید پاتی ہے اس کے بے شمار فائدے ہیں حتی کہ وہ سب سے قوی ممتزج ہے۔ دو چیزوں میں ترکیب کیمیاوی کے لئے اکثر تیسرے مادہ کی ضرورت ہے جو مرکب میں داخل نہیں ہوتا مگر ترکیب کے لئے ضروری ہے۔ اسکو ممتزج (Catalysts) ہیں۔ اگر پانی کی رطوبت موجود نہ ہو تو کوئی ترکیب کیمیاوی واقع نہ ہو سکے۔ انھیں وجوہ سے پانی کو برکت دینے والا فرمایا ہے۔

ونزلنا من السماء ماء مبارکا	اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی برکت دینے والا۔
وانزلنا من السماء ماء طهورا لنحی به بلدة میتا ونسقیه مما خلقنا انعاما واناسی کثیرا ولقد صرفناه بینهم لیذکروا	اور اتارا ہم نے سمار سے پاک پانی کہ زندہ کریں ہم اس سے مردہ بستی کو اور پلائیں اسکو جو ہم نے پیدا کئے چوپائے اور انسان کثیر اور ہم نے پھرایا ہے اسکو ان کے درمیان کہ وہ نصیحت لیں۔

۲۲۔ قوانین فطرت کو توڑ کر پانی کے متعلق ایک خرق عادت واقع کیا ہر جس کے بغیر زمین پر انسان زندہ نہ رہتا۔

قانون فطرت یہ ہے کہ جسقدر زیادہ کوئی جسم گرم ہوتا ہے اسی قدر

نے اسکو پھیلایا۔

۱۹۔ اگر ہوا حاملِ بخاراتِ آب پیدا نہ ہو یعنی پانی اس میں ملا نہ رہے تو تمام نباتات و حیوانات خشک ہو کر ہلاک ہو جائیں۔ چنانچہ افریقہ کے عظیم ریگستان صحارا میں خشک ہوا کے سبب نہ لاش سڑتی ہے نہ پھل اسقدر جلد خشک ہو جاتے ہیں کہ سڑنے کی نوبت نہیں آتی۔ اسی لئے زمین کے ¾ حصہ پر سمندر محیط ہے کہ ہوا کو مرطوب رکھے علاوہ بریں دریا و جھیلیں و جنگل بھی رطوبت ہوا میں اضافہ کرتے ہیں۔

۲۰۔ پہاڑیوں بھی نافع ہیں کہ خشک موسم میں ان سے برابر پانی ملتا رہتا ہے برف کے انبار ادن پر جمع رہتے ہیں اور وہ پگھلتی رہتی ہے اور دریاؤں میں پانی علی الاتصال آتا رہتا ہے۔ اور پہاڑوں کی ناہموار سطح بارش کا پانی روک لیتی ہے اور وہ اس میں جذب ہو کر نیچے نیچے بہتا ہے اور کہیں کہیں چشموں کی صورت میں پھوٹ نکلتا ہے۔ وہ پانی جو بارش سے زمین میں جذب ہوتا ہے وہ زمین میں تھوڑی دور نفوذ کرتا ہے۔ اس کے بعد زمین اس قدر ٹھوس ہے کہ پانی اس میں جذب نہیں ہوتا۔ پس وہ اندر ہی اندر ایک تہہ پر نشیب کی طرف بہتا ہے۔ یہی پانی ہے کہ کنوئیں کھود کر نکالتے ہیں۔ اسکا بیان یہ ہے

وجعلنا فیہا رواسی شامخات	اور بنائیں ہم نے اس میں بلند چوٹیاں
واسقیناکم ماء فراتا	اور پلایا تم کو میٹھا پانی۔
وینزل من السماء من جبال	اور وہ اتارتا ہے آسمان سے پہاڑ (برف کے)
فیہا برد فیصیب بہ من یشاء	جو سرد ہیں پھر جسکو چاہتا ہے اسمیں سے پہونچاتا ہے۔
قل ارءیتم ان اصبح ماؤکم غورا فمن یاتیکم بماء معین	کہو کیا تم نے دیکھا کہ اگر تمہارا پانی زمین کی تہ میں چلا جائے، تو کون لاسکتا ہے تمہارے پاس بہتا ہوا پانی۔

۲۳۔ جذب ثقل پانی کو ہمیشہ نیچے کی سمت لے جاتا ہے اس لئے سمندر کا پانی دریاؤں پر نہیں چڑھتا ان کا پانی میٹھا رہتا ہے لیکن دریا کے دہانے کے پاس سمندر کا پانی کچھ میٹھا ہوتا ہے کیونکہ دریا سے مسلسل میٹھا پانی پہونچتا ہے۔ اس طرح جذر و مد سے دریا کے کچھ حصہ میں ایسا ہی پانی ہوتا ہے اور ایسے ہی پانی میں موتی اور مرجان پیدا ہوتا ہے کیونکہ دریا برابر کیلشیم کے مرکبات خشکی سے حل کرکے لاتا ہے اور موتی و مرجان کیلشیم سے بنتے ہیں۔ ان امور کی طرف ذیل کی آیات میں اشارہ ہے۔

مرج البحرین یلتقیان بینہما برزخ لا یبغیان یخرج منہما اللولوء والمرجان	بہائے دو دریا ملتے ہوئے باہم ان کے درمیان برزخ ہے کہ دونوں ایک حد سے نہیں بڑھ سکتے وہ نکلتا ہے ان دونوں سے موتی و مونگا۔

موتی و مرجان برزخ میں بنتے ہیں لیکن یہاں فرمایا ان دونوں یعنی آب شور اور میٹھے پانی سے اللہ ان کو نکالتا ہے اس طرح اشارہ فرمایا کہ موتی و مرجان کے اجزائے ترکیب ان دونوں سے حاصل ہیں

سمندر کا پانی کھارا ہونا ضروری ہے اس لئے کہ وہ بہتا نہیں۔ پس کھاری نہ ہو تو اس میں تعفن پیدا ہو جائے اور بحری جانور فنا ہو جائیں بلکہ سمندر کا تعفن خشکی کی ہوا کو بھی فاسد کر دے۔

۲۴۔ سمندر کا وجود دیگر جہات سے بھی وسیلۂ تربیت ہے سفر و تجارت کی آسانی۔ اس کی مچھلیوں سے غذا حاصل ہونا موتی اور مرجان کا اموال اور سامان زینت ہونا۔

ربکم الذی یزجی لکم	تمہارا رب ہی ہے جو چلاتا ہے

زیادہ اس کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ یا جسقدر زیادہ کسی جسم کو ٹھنڈا کرد اسی قدر وہ سکڑ جاتا ہے۔

پانی کے لئے اس قانون کو توڑا ہے۔ پانی ۴ ڈگری سنٹی گریڈ تک تو سرد کرنے سے سکڑتا ہے۔ لیکن ۴ سے نیچے صفر درجے تک جتنا ٹھنڈا ہوگا اسی قدر حجم میں زیادہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برف (جو صفر درجے پر بنتا ہے) پانی سے ہلکا ہوتا ہے اسی لئے برف پانی پر تیرتا ہے۔

اسی خرق عادت کا یہ نتیجہ ہے کہ سرد ملکوں میں جب دریا و جھیل جمتے ہیں (جیسے سائبیریا میں) تو ان کی سطح پر کچھ پانی برف ہو جاتا ہے۔ نیچے پانی ہی رہتا ہے اور اوپر کا برف اس سے حرارت کو نکلنے نہیں دیتا۔ اس صورت میں موسم گرما کی حرارت اس سطحی برف کو پگھلانے کے لئے کافی ہوتی ہے اور دریا و جھیل پھر صاف ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کے خلاف ہوتا اور برف پانی سے بھاری رہتا تو وہ جم کر دریا و جھیل و بحر شالی و جنوبی کی تہہ پر بیٹھتا جاتا۔ اور وہ کل جم جاتے۔ موسم گرما کی حرارت ان کو پگھلانے کو کافی نہ ہوتی اور ہر سال کا سرما برف کی مقدار کو بڑھاتا یہاں تک کہ کل سمندر منجمد ہو جاتا۔ اور اس سے اتنی رطوبت نکل کر ہوا میں نہ ملتی کہ بارش ہو سکے۔ کیونکہ سردی میں تبخیر کم ہوتی ہے۔ اور سطح ارض پر انسان کی زندگی ممکن نہ رہتی۔

یہاں سے ظاہر ہے کہ مدبر عالم قوانین فطرت میں تصرف کر کے ان کا رخ اس مقصد کی طرف پھیر دیتا ہے کہ انسان کی تربیت ہو۔

پانی کا یہی وصف پہاڑوں کو توڑتا ہے۔ اس کے شگافوں اور مساموں میں پانی بھر جاتا ہے۔ سردی پاکر جمتا ہے اور پھیلتا ہے۔ پھیلنے سے مساموں کو بڑھا کر شگاف اور شگافوں کو بڑھا کر پہاڑ کو توڑتا ہے۔

کرے تاکہ بہتر حیات کی اہلیت و استحقاق پیدا ہو۔

چنانچہ مخالف جو امر بھی پیش کرے اس کا اسی غرض کی طرف راجع ہونا ان متعدد وجہات سے ثابت ہوگا جن کی مثالیں ہم نے اوپر بیان کیں۔

پس مذکورہ بالا مقدمات تین نتائج پر دلالت کرتے ہیں اول ان سے تدبر و حکمت و صنعت کا عالم میں موجود ہونا ثابت ہے اور یہ تدبر ایک قدیر و علیم صانع کے وجود پر دال ہے۔ دوم اس اہتمام تربیت و تکمیل سے عیاں ہے کہ غرض اس حیات کی تربیت و تکمیل ہے۔ سوم۔ تربیت کی غرض ہمیشہ بہتر درجۂ حیات تک پہونچانا ہوتی ہے لہذا بعد اس حیات کے ایک بہتر درجہ حیات ہونا یقینی ہے۔

قرآن مجید میں ایسے تدبر کی بے شمار مثالیں جا بجا بیان فرمائی ہیں جن کی توضیح اس تفسیر میں آئے گی۔

صورت بیان یہ ہے کہ ہر مقام پر ایسے چند مقدمات کو بیان فرما کر اس پوری دلیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کے سیکڑوں مقدمات قرآن مجید میں مذکور ہیں۔

اکثر مفسرین اسلام اس استدلال کی نوعیت سے غافل رہے اس لئے بہت سی آیات اور چھوٹی سورتیں بالکل ان کی سمجھ میں نہ آئیں۔ ناظرین جنھوں نے اس بحث کو سمجھ لیا ہے بآسانی ایسے مقامات کو سمجھ لیں گے جن کی ایک مثال ہم بیان کرتے ہیں۔

والشمس وضحٰها	شاہد ہے آفتاب اور اس کی پو پھٹنا۔
والقمر اذا تلٰها	شاہد ہے ماہتاب جب وہ اس کے پیچھے آئے۔
والنهار اذا جلّٰها	شاہد ہے دن جب روشن کردیے اس فضا کو
والّيل اذا يغشٰها	شاہد ہے رات جب وہ اس کو چھپالے

الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ	تمہارے لئے کشتی سمندر میں تاکہ تم تلاش کرو اس کا فضل وکرم۔
وھو الذی سخر لکم البحر لتاکلوا منہ لحما طریا وتستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونھا ویخرج منھا اللولوء والمرجان	اور وہ وہی ہے جس نے مسخر کیا سمندر کو تمہارے لئے تاکہ تم کھاؤ اس میں سے تازہ گوشت اور نکالو اس سے زیور جو تم پہنتے ہو۔ اور نکالتا ہے ان میں سے موتی اور مرجان

۲۵ چونکہ مقصود تربیت ہے اور تربیت کے بعد بلند تر مرتبہ دینا ہے اس لئے اس حیات کو عرصہ قلیل بعد ختم کرنے کو موت کے اسباب موجود کر دئے ہیں

وھو الذی خلقکم من طین ثم قضی اجلا	وہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا مٹی سے اور ایک وقت (موت) مقرر کیا

۲۶۔ اور انسان کا ابتلا کیا آلام ومصائب سے یعنی اقربا کی موت سے اور نقصان مال وجان سے اور خوف وخطر سے تاکہ ان مزاحموں کا وجود طاعت کی قدر ومنزلت بڑھاوے۔ اور یہ آلام ومصائب استحقاق نعمت پیدا کریں اور متنبہ ہو کر غفلت سے چونکائیں۔

ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس	اور ہم تمہاری آزمائش کریں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور اموال اور جانوں کے نقصان سے

وجہ استدلال۔ دعویٰ یہ ہے کہ فطرت کی تمام اشیا وحوادث اس غرض کی طرف راجع ہیں کہ انسان چند روزہ زندگی بسر کرے۔ اس میں تربیت پائے وتکمیل

برہان اخلاقیات

عمانوئیل کانٹ نے انسان کی حیات ابدی پر یہ دلیل قائم کی ہے انسان کی علمی و اخلاقی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے اس کی یہ صلاحیت استکمال غیر محدود ہے یعنی کوئی حد معین نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس کی حیات بھی غیر محدود ہے۔

وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے جو صلاحیت انسان میں پیدا کی وہ عبث نہیں ہو سکتی پس اگر صلاحیت غیر محدود ہے تو اس کے استکمال کے لیے حیات بھی غیر محدود ہونا چاہیے۔ ورنہ صلاحیت غیر مستکملہ کا عبث ہونا لازم آئے گا جو محال ہے۔

شبہ ۱۔

اگر دین حق یا اسلام تحقیقی مذہب ہے اور یہ تکمیل ضروری ہے تو لازم آتا ہے کہ بہت ہی کم لوگ داخل جنت ہوں کیونکہ بہت کم لوگ تحقیق پر مستطیع ہیں اور ان میں سے بھی بہت کم تحقیق کرنے والے ہیں۔ پس جب زیادہ انسانوں کا جہنم جانا معین ہوا تو یہ دعوی کہ انسان کی غرض آفرینش بہتر درجۂ حیات کی عطا ہے باطل ہوا۔

خداوند عالم کے پاس علم ازلی تھا کہ اکثر و بیشتر انسان جہنم میں جائیں گے پس جب اس علم و ارادہ کے ساتھ خداوند عالم نے انسان کو پیدا کیا تو غرض آفرینش انسانوں کو جہنم میں ڈالنا ہوئی

جواب۔

چونکہ غرض آفرینش کا پورا ہونا انسان کے عمل ارادی پر موقوف ہے لہذا اگر وہ غرض ایک زمانہ تک پوری نہ ہو تو انسان کی تقصیر ہے۔ اگر زید نے ایک مدرسہ اس غرض سے قائم کیا کہ طلباء کو لائق و فائق بنا کر اچھے مراتب پر پہونچائے۔ سو طلبہ داخل ہوئے چند سال بعد دس سند یافتہ ہوئے۔ دس اپنی بدکرداری سے پولیس کے سپرد ہوئے اور جیل گئے۔ باقی اسّی فیل ہوئے۔ تو یہ کہنا غلط ہوگا کہ زید نے مدرسہ اس غرض سے قائم کیا تھا کہ لوگوں کو جیل بھجوائے اور فیل کرے اگرچہ نتیجہ میں اکثر

والسماء وما بناها	شاہد ہے آسمان اور وہ امور جنھوں نے اس کو قائم کیا.
والارض وما طحٰہا	شاہد ہے زمین اور وہ امور جنھوں نے اس کو ہموار کیا (مذکورہ بالا امور کا ترتیب انسان کی طرف راجع ہونا بیان کرتے ہیں)
ونفس وما سواہا	شاہد ہے نفس اور وہ امر جو اس کو پاک بنائے اور یہ کہ اس نے
فالہمہا فجورہا وتقوٰہا	الہام کیا اس کو اس کی بدکاری و نکوکاری کا (یعنی ضمیر میں اچھے بُرے کام کا بدیہی ادراک رکھا) (یہاں تک دلیل کے مقدمات ہیں اس کے بعد دلیل کا مطلوب ہے) (شاہد ہیں یہ سب امور اس بات پر) کہ
قد افلح من زکٰہا وقد خاب من دسٰہا	وہ نفس کامیاب ہوا جس نے تزکیہ کیا۔ اور وہ ناکام ہوا جس نے اس کو پست کر دیا۔

یعنی جس نے تربیت پائی و تکمیل کی عمل خیر سے وہ زندگی بن کامیاب ہوا جس نے ضلالت و بدی سے نفس کو ذلیل کیا۔ گرا دیا۔ وہ ناکام ہے

یہ صریح اشارہ ہے اخلاقی ترقی کے مطلوب ہونے کی طرف

شبہ ۲

قرآن مجید میں خبر ہے کہ کفار و مشرکین و فاسق عذاب ابدی میں مبتلا ہوں گے۔ لیکن زمانہ قلیل کے گناہوں کی غیر محدود سزا منافی عدل ہے

جواب ۔

انسان کو جو صلاحیت استکمال عطا ہوئی ہے وہ بڑے سے بڑے مرتبہ تک پہنچا کر حیات جاودانی اور جمیع نعمات کے حصول کا ذریعہ ہے اس لئے وہ بے بہا امانت ہے پس جو شخص اس غیر محدود قدر و قیمت کی عطا کو ضائع کر دے اور اپنے مالک حقیقی اور مربی کی نافرمانی کرے وہ غیر محدود سزا کا مستحق ہے۔ لیکن اس نافرمانی کے ساتھ اس سے بہت سے نیک کام بھی ہوئے ہیں جن کی جزا اس سزا کو لامحالہ محدود کر دے گی اس لئے کوئی بھی ابدالآباد تک جہنم میں نہ رہے گا۔

قرآن مجید میں جزا و سزا کے تین ضابطے بیان فرمائے ہیں

اول۔ ہر عمل خیر و بد کی جزا و سزا ہونا

زلزلہ

ومن یعمل مثقال ذرۃ	اور جس نے ذرہ برابر برا کام کیا وہ اس
شرا یرہ ومن یعمل مثقال	کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ بھر بھی
ذرۃ خیرا یرہ	نیک کام کیا وہ اس کو دیکھے گا۔

یہ مسلم ہے کہ جو کوئی بھی برا کام کرے گا خواہ مومن خواہ کافر وہ اس کی سزا پائے گا۔ لہذا دوسری آیت سے بھی یہ ثابت ہے کہ ہر مومن و کافر اپنے عمل کی جزا پائے گا۔ اور آیت میں تعمیم بھی ہے۔ کوئی تخصیص نہیں ہے۔

دوسرا ضابطہ۔ اعمال خیر اور اعمال بد کا مقابلہ کیا جائیگا جو زیادہ ہوں گے ان کے مطابق انجام ہوگا۔

فاما من ثقلت موازینہ	پس جس کا پلہ بھاری ہوگا تو اس کے لئے
فھو فی عیشۃ راضیہ	زندگانی خوش ہے۔

کے لئے ہی ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ فیل کرنا اور سزا دینا اقتضائے عدل سے اصل غرض کے تحت میں داخل ہوئے۔ نہ یہ کہ وہ اصل غرض ہوں

جواب کی مزید تفصیل

اس شبہ میں یہ امر مفروض ہے کہ اکثر انسان جہنم میں جائیں گے اور یہ غلط ہے۔ اس کا رد ہم تعارف میں کر آئے یہاں قرآن مجید سے اس کا رد پیش کرنا ہے تکلیف بقدر استطاعت ہے۔ لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔ اللہ تکلیف نہیں (یعنی ذمہ دار نہیں قرار دیتا) دیتا کسی نفس کو مگر اس کی استطاعت کے اندر۔

لہذا غیر مستطیع تحقیق سے اسلام قبول نہ کرنے پر مواخذہ نہ ہوگا اور اگر ان کے وہ اعمال زیادہ ہیں جن کی بھلائی عقلی ہے اور وہ کم جن کی برائی عقلی ہے تو وہ اعراف میں جائے گا۔

جاہل و گنوار بھی جانتے ہیں کہ انصاف و احسان و ایفائے عہد و صدق و عفت اچھے ہیں اور ظلم و ستم و نقض و عہد و کذب و فریب برے کام ہیں۔ اسی ادراک کا نام تکلیف عقلیہ ہے۔

اور تکلیف عقلیہ ہر عاقل و بالغ سے متعلق ہے عام اس سے کہ وہ مستطیع تحقیق ہو یا نہ ہو۔

چونکہ عادتاً انسانوں کے اچھے کام بمقابلہ برے کاموں کے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ روزانہ زندگی میں انسان کو اپنے عیال و اعزا و احباب سے زیادہ سابقہ رہتا ہے جن کے ساتھ وہ عدل و احسان سے پیش آتا ہے اور عوام سے بھی اس کی عمومی روش صالح ہوتی ہے اس لئے اکثر انسانوں کے اعمال حسنہ بمقابلہ سیئہ زیادہ ہوتے ہیں اسی لئے وہ جہنم نہ جائیں گے۔ ان کا مقام اعراف ہوگا۔ اور پھر اعراف میں تکمیل کر کے داخل جنت ہوں گے جیسا کہ ہم ابھی قرآن سے ثابت کریں گے

ہونا مذکور ہے۔ اور کہیں اس کا محدود زمانہ کے لئے ہونا مذکور نہیں۔

جواب

جہاں عذاب ابدی مذکور ہے وہ شرک یا کفر یا قتل مومن کی سزائے واجب کا ذکر ہے۔ اور یہ غلط ہے کہ عذاب جہنم کے محدود ہونے کا ذکر نہیں چنانچہ ذیل کی آیات دیکھئے۔ ایک آیت میں مدت دراز یا مدت ہائے دراز کا ذکر ہے اور مدت دراز کا اطلاق محدود زمانہ پر ہے۔

لابثین فیہا احقابا	وہ رہیں گے اس میں مدت ہائے دراز
قال النار مثوٰکم خالدین فیہا الا ما شاء اللہ	کہا جائے گا کہ جہنم تمہارا ٹھکانہ ہے کہ ہمیشہ اس میں رہو سوائے اس کے کہ اللہ جو چاہے۔
خالدین فیہا ما دامت السماوات والارض الا ما شاء ربک	وہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان اور زمین ہیں سوائے اس کے کہ جو کچھ تیرا رب چاہے

ان دونوں آیات میں خلود سے استثنا واقع ہے اور مشیت کا رحمت و عدل سے متعلق ہونا بیان ہو چکا ہے۔ خلود کے خلاف سے متعلق ہونا ہی مذکور ہے ورنہ اس استثنا کا وارد ہونا عبث ہوگا۔ جو محال ہے۔

غرض آفرینش کا پورا ہونا

سورہ اعراف کی وہ آیات جن میں اعراف کا ذکر ہے ثابت کرتی ہیں کہ اہل اعراف کی زندگی تکلیف و مشقت کی ہوگی۔ اور تکمیل کرنے کے بعد وہ داخل جنت ہوں گے جیسا کہ ہم ابھی ثابت کرتے ہیں۔ اور چونکہ اہل جہنم بھی بالآخر جہنم سے رہائی پائیں گے لامحالہ وہ بھی اعراف جائیں گے اور تکمیل کر کے مثل دیگر اہل اعراف کے داخل

وامامن خفت موازینہ — اور جس کا پلہ ہلکا ہوا تو اس کی ماں

فامہ ھاویہ — (آغوش مادر) جہنم ہے

یعنی اس کا ٹھکانہ اور رزق جہنم سے ہوگا

سوم۔ بعض اعمال کی سزا عذاب ابدی ہے لیکن اس میعاد

میں اعمال حسنہ کمی کرکے محدود زمانہ کر دیں گے۔

مثلاً مستطیع تحقیق سے شرک یا کفر مستوجب عذاب ابدی ہے یا مومن کا قتلِ

عمد مستوجب عذاب ابدی ہے۔ لیکن کوئی مجرم ایسا نہیں کہ اس سے صرف شرک

یا کفر یا مومن کا قتلِ عمد واقع ہوا اور اس کے کچھ اعمال خیر نہ ہوں۔ اور ان اعمال

خیر کی جزا ضرور ہوگی۔ لہٰذا وہ سزا کی میعاد میں کمی کرکے محدود بنا دے گی۔ کیونکہ اگر

اس نے کمی کرکے غیر محدود سزا کو محدود نہ کیا۔ وہ بعد منہائی بھی غیر محدود رہی تو کوئی کمی نہ

ہوئی۔ لیکن کمی ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا محدود ہونا ضروری

علمائے اسلام نے تقلیل سزا کی دو صورتیں تجویز کی ہیں اور ان دونوں کی نفی قرآن

مجید میں موجود ہے۔ ایک یہ کہ عذاب کی شدت میں تخفیف ہوگی۔ دوسری یہ کہ درمیان

میں عذاب سے مہلت ملتی رہے گی۔

قرآن مجید کا بیان

بقرہ ۹ — ولا یخفف عنہم العذاب — تو ان پر عذاب میں تخفیف نہ کی جائے

آل عمران ۹ — ولا یخفف عنہم العذاب — گی

نحل ۹ — فلا یخفف عنہم العذاب — تو ان پر عذاب میں تخفیف نہ ہوگی

ولا ھم ینظرون۔ — اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

پس جب عذاب میں نہ تخفیف ہوگی نہ درمیان میں مہلت ملے گی اور جزائے اعمال

خیر سے کمی ضروری ہے تو لامحالہ مدت عذاب میں کمی ہوگی

شبہ ۳۔ معترض کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں اکثر عذاب جہنم کا ابدی

رجالاً یعرفونہم بسیمٰہم	لوگوں کو (اہل نار میں سے) جن کو وہ پہچانتے تھے ان کے چہروں سے
قالوا ما اغنیٰ عنکم جمعکم	بولے تمہارا مال تمہارے کام
وما کنتم تستکبرون	نہ آیا اور نہ وہ تکبر جو تم کرتے تھے
اَھٰؤُلَاءِ الذین اقسمتم	کیا یہی (اہل جنت) وہ لوگ ہیں جن
لاینالہم اللہ برحمۃ ادخلوا	کے بارہ میں تم قسم کہتے تھے کہ
الجنۃ لاخوف علیکم	اللہ ان پر اپنی رحمت نہ کرے گا
ولا انتم تحزنون	(حالانکہ ان کو رحمت ہو چکی)
	وہ داخل ہوئے جنت میں (اس
	خطاب کے ساتھ کہ) تمہارے لئے
	نہ خوف ہے اور نہ تم محزون ہوگے

نوٹ۔ جن کثیر مطالب پر ان آیات کی دلالت ہے ان میں سے یہاں ہم ان مطالب کی توضیح کریں گے جو اہل اعراف کے حال میں ہیں۔

۱۔ ان آیات میں اہل جنت اور اہل نار کے ذکر کے ساتھ اہل اعراف کا ذکر بھی اصحاب الاعراف کے نام سے آیا ہے جس سے بعد حشر تین جماعتیں معین ہوتی ہیں۔ اہل جنت۔ اہل نار۔ اہل اعراف۔

۲۔ درخت خرما پر چڑھے ہونے سے بعض اہل جنت نے ان کو دیکھا۔ دنیا میں وہ شناسا تھے۔ پہچانا۔ اہل جنت نے ان پر سلام بھیجا یعنی سلامتی کی دعا دی۔ اہل جنت وہ مقبول بارگاہ ہیں جن کی دعا مشیت کے منافی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اہل اعراف کے لئے سلامتی ثابت ہے

۳۔ اب خداوند عالم فرماتا ہے کہ وہ داخل جنت نہ ہوئے اور وہ امید میں ہیں کہ داخل جنت ہوں۔ چونکہ اہل اعراف کا ذکر مقام مدح میں ہے ان کے اقوال مذکورہ سب حق ہیں اس لئے ان کا امید جنت میں ہونا

جنت ہوں گے۔ پس غرض آفرینش یہی رہی کہ انسان کو بہتر درجہ حیات عطا ہو۔

کیفیت اعراف

جو لوگ مستطیع تحقیق نہیں وہ قرآن مجید کے مخاطب نہیں

قرآن مجید نے اپنے مخاطبین کے انجام کو بالتفصیل بیان کیا ہے اور جو اس کے مخاطب نہیں ان کے احوال میں اختصار کیا ہے سورۂ اعراف کی یہ آیات آخرالذکر کے احوال کی کاشف ہیں کہ یہ لوگ نہ جنت میں ہیں نہ دوزخ میں بلکہ ایک تیسرے حال میں ہیں وہ کھجور توڑنے نخل خرما پر چڑھے ہیں یعنی مشقت میں ہیں۔ اکتساب معاش کر رہے ہیں سو وہ اہل جنت اور اہل نار سے ہمکلام ہوئے ہیں اور اس امید میں ہیں کہ وہ داخل جنت ہوں گے۔ جس طرح کہ اس حیات میں ہم لوگ

الاعراف

وعلی الاعراف رجال یعرفون	اور کچھ لوگ درخت ہائے خرما پر
کلا بسیمٰہم۔ ونادوا اصحاب	ہوں گے۔ پہچانے جائیں گے اپنے
الجنۃ۔ ان سلام علیکم۔	چہروں سے سبب
لم یدخلوھا۔ وھم یطمعون	اور ان کو آواز دی اہل جنت
	نے "سلام ہو تم پر"۔ وہ نہیں
واذا صرفت ابصارھم تلقاء	داخل ہوئے جنت میں درحالیکہ
اصحاب النار قالوا ربنا	وہ اس کی امید میں ہیں اور جب
لا تجعلنا مع القوم الظالمین	ان کی نگاہیں اہل نار کی طرف پھریں
	تو بولے اے ہمارے رب ہم کو
	ظالم قوم کے ساتھ نہ کرنا
ونادی اصحاب الاعراف	اور اہل اعراف نے ندا دی کچھ

اعجاز قرآن

کوئی شخص ایسا کلام تصنیف نہیں کرسکتا جس میں وہی کلام کی خوبیاں ہوں جو قرآن مجید میں ہیں اس میں ایسے اوصاف اور صنعتیں ہیں کہ عالم مطلق ہی اس کی تصنیف پر قادر ہو سکتا ہے۔

اگر ہم نے یہ بات ثابت اور عیاں کردی تو قرآن مجید ایسا معجزہ ہوگا جس سے بیک وقت عالم مطلق کا وجود بھی ثابت ہوگا۔ اس کے معجزہ ہونے سے حامل کا رسول ہونا بھی ثابت ہوجائے گا۔

اس صورت میں اعجاز قرآن ہی ایسی ظاہر دلیل ہے کہ مطلوب کو بلا شبہ وشائبہ ثابت کرتی ہے۔ اور معجزات میں یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے متواتر معجزات فرعون پر ان کی رسالت ثابت نہ کرسکے۔ وہ ہمیشہ ان کو سحر پر محمول کرتا رہا

قرآن مجید کے اعجاز ہونے کا دعویٰ بار بار قرآن میں وارد ہوا ہے باوجود اس کے علمائے اسلام کی ایک جماعت نے قرآن کے فی نفسہ معجزہ ہونے سے انکار کیا ہے۔ اور کہا کہ خدا نے کفار کے ارادہ کو اس سے پھیرے رکھا کہ وہ اس کی مثل لائیں۔ یہی اعجاز ہے۔ ورنہ وہ اس کی مثل لا سکتے تھے۔ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر جلد اول میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ قرآن کی چھوٹی سورتوں کے مثل بھی کوئی نہیں لا سکتا ہے تو یہ مجادلہ ہے۔ زبردستی ہے۔ دھینگا دھینگی ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے قرآن جیسا کہ انہوں نے سمجھا ان کو (معاذ اللہ) ہزل اور مزخرف نظر آیا جیسا کہ وہ ان کی تعبیر پر ہوجاتا ہے۔ پھر وہ اس کی خوبی اور اعجاز کا دعویٰ کیسے کرتے پس ہماری اس بحث کے دو رخ ہیں۔ ایک تو اہل اسلام پر قرآن کا اعجاز ثابت کرنا۔ دوسرے منکر اسلام پر اس کا اعجاز عیاں کرنا۔ منکرین کے مقابلہ میں قرآن کے ایسے اوصاف کو علی الاتصال واضح کیا ہے جن پر انسان قادر ہی نہیں ہوسکتا۔ بحث مسلسل ایک ہے لیکن اس میں دونوں جہتیں ملحوظ ہیں۔

خداوند عالم کو پسند ہے اس لئے وہ امید باطل نہیں ہے۔ پس وہ داخل جنت ہوں گے۔

۴۔ اب یہ ذکر ہے کہ اہل اعراف کی نظر اہل نار پر پڑی جو ان کے شناسا تھے ان کو پہچانا اور سابق ضلالت پر ملامت کی اور مستحق عذاب قرار دیا اہل اعراف نے کہا خداوند ا ہم کو اہل نار کے ساتھ نہ کرنا جس سے ثابت ہوا کہ وہ جہنم میں نہیں ہیں اور خدا سے دعا بھی کی کہ ہم کو جہنم سے بچا رکھ یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ خدا سے دعا بھی کرتے ہیں اہل اعراف نے محاسبہ حشر دیکھا۔ اب ان کو یہ معرفت حاصل ہو گئی ہے کہ اللہ موجود ہے اور اعمال کی جزا و سزا ہے۔ انہوں نے اہل نار سے کہا کہ تم منکر آخرت تھے حالانکہ وہ اہل نار اللہ کو مانتے تھے کیونکہ ان کا قول مذکور ہے کہ لاینالہم اللہ برحمۃ۔

۵۔ یہ اہل اعراف ان لوگوں کے شناسا ہیں جو اتباع شریعت سے جنت میں داخل ہوئے اور کچھ شریعت کو رد کر کے داخل نار ہوئے۔ لہذا یہ اس زمانہ کے لوگ ہیں جبکہ شریعت نازل ہو چکی ہے۔ لیکن اہل اعراف مستطیع تحقیق نہ ہونے سے اطاعت الٰہی بجا لا کر داخل جنت نہ ہوئی ان کو اطاعت الٰہی کا موقع دنیا میں میسر نہ ہوا۔ لہذا اب اعراف میں وہ موقع دیا گیا کہ اطاعت الٰہی کر کے داخل جنت ہوں۔

۶۔ ان اہل نار کے عذاب کی وجہ انکار آخرت کرنا بیان ہوئے اس لئے یہ لوگ فرقہ مرجیہ کے مانند ہیں۔

۷۔ ان کی نظر میں نعمات دنیا اس قدر مرغوب تھیں کہ زندگی کا مقصد بجائے حصول آخرت کے حیات دنیا قرار دیا اور شریعت کی غرض صرف اصلاح معاشں قرار دی۔ اس کی طرف اشارہ اس آیت میں ہوا۔

ما اغنیٰ عنکم جمعکم۔ تمہارا جمع کیا مال کام نہ آیا۔

۸۔ عبادت کرنا اس طرح ثابت ہے کہ وہ خدا سے دعا کرتے ہیں اور اس کی جزا ان کو ملنا ضروری ہے۔

غور و فکر کریں تو اس کی حقیقی مراد تک پہونچیں اور اس کا جامع و مانع ہونا عیاں ہو۔ اگر وہ کسی غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو ضرور مبہم ہوتا کیونکہ اس کا موضوع بحث ایسا ہی ہے۔

پس جامع و مانع ہونا اس کے اعجاز ہونے کی اور من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

نوٹ۔ اختلاف کے معنی پیچھے رہ جانا۔ یعنی صحیح مطلب تک نہ پہونچنا پس اختلاف معنی اختلاف از حق قرآن مجید میں بار بار آیا ہے جیسا کہ ہم نے آگے ثابت کیا ہے۔

۲۔ معانی کثیرہ پر دلالت اور اس کا اعجاز ہونا

دلالت کی چار قسمیں ہیں۔ مطابقی ۱ تضمنی ۲ - التزامی ۳ - اور مجازی ۴ کسی کلام میں دلالت مطابقی کے ساتھ دلالت التزامی و تضمنی سے متعدد مطالب پر دلالت کرنے کے پانچ اسلوب ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے لئے کثرت معانی کا پانچ متفرق آیات ہیں دعویٰ وارد ہے اور جہاں وہ آیت ہے اسی رکوع میں ایک خاص اسلوب یا صنعت کے ساتھ ہر آیت سے دلالت کثیر پیدا کی ہے۔ پس ان پانچ آیتوں میں پانچواں اسالیب کا صرف ہو گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے دوسرے رکوع میں یہ آیت ہے۔

وکل شیء فصلناہ تفصیلا	اور ہم نے (قرآن میں) ہر بات کو واضح کر دیا ہے جیسا کہ چاہئیے

یعنی تمام اصولی و فرعی مسائل بیان کا احاطہ قرآن مجید نے کیا ہے اور وہ بہت کثیر ہیں۔ ہذا عبارات قلیل کی دلالت معانی کثیرہ پر ہے اسی رکوع میں بیان کے ان لازمی نتائج کو حذف کر دیا ہے جو قاعدہ منطق سے اس سے حاصل ہیں۔

اس بحث کو خود قرآن مجید نے آسان اور صاف کر دیا ہے۔ فرمایا ہے کہ قرآن مجید چار جہات سے معجزہ ہے۔ اول یہ کہ وہ الہیات اور قوانین یہ بلا صرف اصطلاحات جامع و مانع کلام ہے حالانکہ یہ ایسے موضوع ہیں کہ ان پر حکماء اور مقننین باوجود صرف اصطلاحات و تعریفات کے جامع و مانع کلام نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہیگل کا کلام اس کے تابعین کی دو جماعتوں میں جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں مختلف تعبیروں کا محتمل ہے۔ یہی حال افلاطون کی تصانیف کا ہے اور قوانین کی مختلف تعبیروں کا حال تو مختلف بڑی کورٹوں کے متضاد نظائر سے عیاں ہے۔

دوسری جہت اعجاز قرآن کی عبارات قلیل کا معانی کثیر پر دلالت کرنا ہے۔ اور اس قدر کثیر مطالب کا احاطہ کرنا ہے جو حیطہ خیال سے باہر ہیں۔ تیسری جہت اس میں دیگر محاسن کلام کا بے نظیر اجتماع ہے۔ چوتھی جہت اس کی تالیف میں ایسی صنعتیں ہیں کہ سوائے عالم مطلق کے کوئی اور ان پر قادر نہیں ہو سکتا۔

ان چاروں جہات سے قرآن کے اعجاز ہونے کا دعویٰ ذیل کی آیات میں ہے۔

۱۔ جامع و مانع ہونے کا دعویٰ

سورہ نساء

افلا یتدبرون القرآن	پھر کیوں نہیں تدبر کرتے قرآن میں
ولو کان من عند	حالانکہ اگر وہ اللہ کے سوا غیر کی
غیر اللہ لوجدوا فیہ	طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں کثیر
اختلافا کثیرا	محل اختلاف پاتے (یعنی طرح طرح تعبیر کا محتمل ہوتا)

لیکن ایسا ہے نہیں بلکہ وہ جامع و مانع کلام ہے۔ اس لئے اگلی آیا میں

اس بحث کو ہم نے بڑی تفصیل سے آگے بیان کیا ہے وہاں ملاحظہ کیجئے۔

تیسرا دعویٰ۔ یہ کتاب ہر کتاب سے محاسن کلام کے اعتبار سے بہتر ہے

اور اللہ نے نازل کیا بہترین کلام

چونکہ اس آیت کے حکم سے قرآن مجید ہر کلام سے احسن ہے۔ اس لئے کوئی کلام حسن میں اس کی برابر یا مثل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ اعجاز ہے۔ اور چونکہ فصاحت۔ بلاغت۔ جامع و مانع ہونا محاسن کلام ہیں۔ یہ سب اوصاف قرآن کے لئے بدرجہ اتم ثابت ہیں۔

چوتھا دعویٰ۔ اس کتاب کی تالیف اس وضع پر ہے کہ عالم مطلق کے سوا اس کی تالیف پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا۔

بنی اسرائیل۔ ۹

قل لئن اجتمعت الجن	کہو کہ اگر جن وانس جمع ہو جائیں کہ
والانس علی ان یاتوا بمثل	اس قرآن کی مثل لے آئیں تو نہ
ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ	لا سکیں گے اس کی مثل اگرچہ
ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا	وہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔

کسی جہت سے اس کتاب کی مثل ممکن نہیں نہ حسن کلام میں نہ صنعت تالیف میں وہ صنعتیں جو اس کی تالیف میں صرف ہوئی ہیں ان میں کہ بعض یہ ہیں۔

۱۔ اس میں مقدمہ کتاب ہونا اور اس کا کامل ہونا۔

۲۔ قرآن مجید میں مختلف مضامین پر جابجا آیات وارد ہوئی ہیں۔

لیکن اگر ان کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے یکجا جمع کر لو اس طرح کہ سابق کو پہلے اور لاحق کو بعد وعلیٰ ہذا آخر تک تو اس موضوع پر ایک منظم و مرتب

دوسری صنعت۔ سورہ یٰس کے دوسرے رکوع میں یہ آیت

کل شیء احصیناہ — ہم نے ہر شئی کا احصاء اس واضح
فی امام مبین — پیشوا (یا رہبر) میں کیا ہے۔

اس رکوع کی آیات میں نتائج کا بیان ہے اور نتائج کے لئے جو مقدمات ضروری ہیں ان کا حذف ہے۔ اور نتیجہ سے عیاں ہیں۔ پس مجرد نتیجہ کے بیان سے معانی مقدمات پر دلالت کی ہے۔

تیسری صنعت۔ سورہ یونس۔ ۴۔ میں قرآن کے کثیر معانی کی طرف اس آیت سے اشارہ ہوا۔

بل کذبوا بما لم — بیشک انہوں نے اس کی تکذیب
یحیطوا بعلمہ — اس وجہ سے کی کہ وہ اس کے مطالب
ولما یاتہم تاویلہ — کا احاطہ نہ کر سکے اور ان کو اس
کی تعبیر کرنا نہ آئی۔

یعنی قرآن مجید پر یہ لوگ ضرور ایمان لے آتے اگر وہ اس کے مطالب کثیر کا احاطہ کر لیتے کیونکہ اس کی کثرت معانی اعجاز ہے اور اس سے یقین پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلام خدا ہے۔ اس رکوع میں دو مقدّ بیانوں کے لازمی نتائج کو مقدر کیا ہے۔ یعنی کسی استدلال کے بعض قضیوں کو بیان کر کے باقی کی طرف اشارہ کرنا۔

چوتھی صنعت۔ ایک بیان میں کسی خاص شخص سے خطاب لا کر اس بیان کے مطلب کو اس کی طرف بھی راجع کرنا اور اس طرح اس کے دو معنی پیدا کرنا۔

پانچویں صنعت۔ ایک امر کا اجمالی بیان اور اس کی سابق تفصیل کی طرف اشارہ کرنا اور ان دونوں سے جو نتائج حاصل ہوں ان کی طرف اشارہ کرنا۔

۵۔ ایک ہی مطلب کو لفظ و ترکیب بدل کر اکثر بیان فرمایا ہے۔ یہ تصریف آیات ہے۔ تصریف میں یہ التزام ہے کہ بعد کی آیت پہلے آیت کے مضمون پر کچھ اضافہ کرتی ہے۔ اس طرح مقدم و موخر آیات و سوروں کا پتہ چلتا ہے یہ بھی التزام ہے کہ اول ایک حکم دلالت التزامی سے حاصل ہوتا ہے بعد کی آیت میں اس کا تصریحاً ذکر آتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید کے مقدم اور موخر اجزا کا تعین ہوتا ہے۔

۶۔ قرآن مجید میں جن حقائق کا بیان ہے ان کی صحت کی دلیل کی طرف یا تو وہیں اشارہ ہے یا دلیل سابقاً مذکور ہو چکی ہے۔ اس طرح قرآن مجید کا کل بیان مبرہن ہے۔

۷۔ کل قرآن مجید پر ترتیب نزول کے اعتبار سے نظر کیجئے سب سے زیادہ ضروری حکم اول ہے اس کے بعد اہمیت کے اعتبار سے احکام مرتب ہیں ان تمام مطالب کی تفصیلی بحث اور ثبوت آگے آتا ہے

۸۔ قرآن مجید کی بلاغت حیرت انگیز ہے۔ جملہ میں ہر لفظ دوسرے لفظ سے مناسبت رکھتا ہے اور برمحل واقع ہے اس کے ساتھ ایجاز بھی انتہائی ہے۔ اسی ایجاز اور مناسبت سے یہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ اگر فعل کا پورا بیان ہے تو فاعل کی طرف محض اشارہ ہے کیونکہ فعل کے ساتھ اس کی مناسبت خود فاعل کی پوری کیفیت بتاتی ہے۔ اور اگر فاعل کا پورا بیان ہے تو فعل کا اجمالی ذکر کافی ہوا ہے۔

مناسبات کی مثالیں

۱۔ خداوند عالم کے لئے قرآن میں تین اسم ذات آئے ہیں

اللہ۔ رحمٰن۔ رب۔

۱۔ لفظ اللہ کا مفہوم مستجمع صفات کمال ہے یعنی جس کی ذات میں سب صفات کمال جمع ہوں۔ یعنی محمود مطلق۔ صفات کمال میں عالم مطلق۔ قادر مطلق۔ خیر مطلق

بحث حاصل ہوتی ہے مثلاً ہم نے ان سب انبیا کے احوال جو قرآن میں مذکور ہیں تمام سورتوں سے ترتیب نزول کے اعتبار سے اخذ کر کے جمع کئے ہیں۔ جو آگے آئیں گے۔

اس طرح جمع کرنے سے ہر نبی کا کارنامہ رسالت اس وضع پر مرتب حاصل ہوا کہ پہلے کا واقعہ پہلے اور اس کے بعد کا بعد میں۔ علی ہذا آخر تک۔ تو باوجود اس قدر انتشار مطالب کے کہ ایک ایک نبی کا حال چالیس چالیس سورتوں میں پاشان ہے ترتیب زمانی کا ملحوظ رکھنا عالم مطلق ہی کے لئے ممکن ہے۔

۳۔ انبیا دو طرح کے ہیں ایک وہ جن کی بعثت قوم کے لئے عذاب دنیا کا مقدمہ ہوئی جیسے نوحؑ۔ ہودؑ۔ صالحؑ۔ شعیبؑ۔ لوطؑ۔ ان سب کا حال ایک ہی نقشہ وخاکہ پر ہے۔ پہلے بعثت کا ذکر و انذار ہے پھر قوم کا رد و انکار۔ پھر خیر عذاب سے تنبیہ۔ پھر نزول عذاب کا ذکر۔ پھر ان کے مقام کا نام۔ پھر بعض مومنین کا نبی کے ساتھ عذاب سے بچ جانا۔ پھر عبرت دلائی ہے پھر ان کے عذاب کے آثار قدیمہ کی طرف متوجہ کیا ہے۔

ہر ایسے نبی کے ذکر میں مقام کا نام بیان کے ٹھیک بیچ میں آیا ہے کل بیان کے اس قدر جا بجا پاشان ہونے کے ایسا التزام عالم مطلق ہی کے لئے ممکن ہے۔ باقی انبیا کا حال دوسرے نقشہ وخاکہ پر ہے جس کا التزام قائم ہے

۴۔ قرآن مجید کی تعبیر کے قاعدے خود قرآن بیان کرتا ہے اور ہر قاعدہ کا ذکر التزاماً بارہ بارہ مقام پر آیا ہے علی ہذا زیادہ اہم حکم کا بیان ۵۰-۵۰ مرتبہ آیا ہے جیسے ایمان باللہ کی تفصیل میں اس کا قادر مطلق ہونا و عالم مطلق ہونا پچاس پچاس مرتبہ وارد ہے اس سے کم کسی امر کا بیان نہیں ہے۔ اس تکرار سے ایک تو حکم کی اہمیت معلوم ہوئی دوسرے قرآن کے مکمل ہونے کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر قرآن کا کوئی جزء گم ہو گیا ہوتا تو ہر حکم اعتقادی اور عملی اس معین تعداد سے کم پایا جاتا جو اس کے لئے معین ہے۔

وقالوا ما الرحمٰن	مشرکین عرب نے کہا رحمٰن کیا
انی اعوذ بالرحمٰن	مریمؑ نے کہا میں رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں
منک الرحمٰن علی	یہاں توریت تکوین باب کا حوالہ ہے
العرش استوی	ان آیات میں بتایا ہے کہ اسلام کا
لا الٰہ الا ھو الرحمٰن	معبود وہی ہے جو اہل کتاب میں رحمٰن
الرحیم۔ بسم اللہ الرحمٰن	کہا جاتا ہے۔ اتحاد دین الٰہی کی
الرحیم	طرف اشارہ ہے۔

خداوند عالم جب بصیغہ واحد متکلم آتا ہے تو فعل یا صفت کا اس کی ذات سے مخصوص ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے

ماخلقت الجن والا	یعنی میں نے ہی جن و انس کو خلق کیا
نس الا لیعبدون	اور کوئی نہیں کر سکتا
انی جاعل فی الارض	میں ہی اپنا نائب بناتا ہوں
خلیفہ انی اعلم مالا	میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے
تعلمون انی جاعلک	میں تجھکو انسانوں کا امام بنانے والا ہوں
للناس اماما انی	میں تجھکو وفات دینے والا اور اٹھا
متوفیک ورافعک الی	لینے والا ہوں

خداوند عالم جہاں بصیغہ جمع متکلم مذکور ہے وہاں علاوہ تخصیص کے اظہار عظمت وجلال منظور ہے۔

نحن اقرب الیہ من	ہم اس سے بہ نسبت اس کی رگ
حبل الورید ولقد خلقنا	گردن کے زیادہ قریب ہیں
السموات والارض	(باعتبار علم و قدرت)
قلنا یا نار کونی برد	اور ہم نے آسمان اور زمین بنائے
	ہم نے کہا کہ اسے آگ ٹھنڈی ہو جا

ہیں۔ قرآن مجید کی جس آیت میں لفظ اللہ آئے گا اس میں فعل محمودیت کا اقتضا ہوگا۔ اگر کوئی صفت آئی ہے تو وہ محمودیت سے متفرع ہوگی۔ اگر اللہ کا یہ مفہوم ملحوظ نہ رہے تو آیت کے درست معنی سمجھ میں نہ آئیں گے۔

۲۔ رحمٰن خدا کا وہ اسم ذات ہے جو اہل کتاب میں رائج تھا۔ انہیں سے مخصوص ہے۔ عرب یہ نام نہ جانتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے جس جملہ میں لفظ رحمٰن آیا ہے اس کے محمول کی علت حمل رحمت کا اقتضاء ہے یا اہل کتاب وصحائف قدیم کی آیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ تلمیح ہے۔

۳۔ اسم رب بغیر مضاف کے نہیں آتا ہے۔ رب کے معنی تربیت کرنے والا جس جملہ میں رب آتا ہے۔ اس میں اقتضائے ربوبیت مذکور ہوتا ہے اور چونکہ مربی مالک مربوب ہوتا ہے رب بمعنی مالک بھی آیا ہے۔

حسب ذیل مثالیں دیکھیے۔

اللہ خالق کل شیء	محمودیت وقدرت کاملہ کا اقتضاء
اللہ لطیف بالعباد	محمودیت کا اقتضاء
اللہ یبسط الرزق	//
قل ءانتم اعلم ام اللہ	علم مطلق کا اقتضاء
	//

اسم رب کا صرف

وانہ لتنزیل رب العالمین	عطاء ہدایت من باب التربیت
رب	یعنی اہل سماء و اہل ارض کا تربیت کرنے والا
المشرقین ورب المغربین	اہل شرق اور اہل غرب کی تربیت کرنے والا

۰ اسم رحمٰن کا صرف

ولا انتم عابدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین

اور نہ تم میں یہ آمادگی کہ میری سے عبادت کرو

تمہارے لئے تمہارا دین ہے میرے لئے میرا دین۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ مشرکین نے مسلمانوں کو ساتھ لے کر مشترک عبادت کرنا تجویز کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مومن تمہاری عبادت کا نہ ارادہ کر سکتا نہ اس میں اس کی استعداد ہے۔ اور تم نہ مومن کی سی عبادت کی استعداد رکھتے ہو اور نہ آمادگی۔

فعل عبادت کا اختلاف مشرک اپنے معبودوں کے جا و بیجا غضب سے بچنے اور ان کی عنایت حاصل کرنے کو خوشامد کرتا ہے اور پسندیدہ چیزیں چڑھاتا ہے۔ مومن اپنی عبادت کو عروج و فضل کا ذریعہ جانتا ہے جو وسیلہ قرب ہے۔

استعداد عبادت کا فرق مومن صرف محمود مطلق کو مستحق عبادت جانتا ہے اور اسی کو عالم پر متصرف مانتا ہے۔ اس لئے غیر کی عبادت کی نہ استعداد ہے نہ آمادگی ہو سکتی ہے۔ مشرک اور معبودوں کو بھی مانتا ہے جو حکم الٰہی کے خلاف ہے اس لئے اس میں اطاعت الٰہی کی استعداد باقی نہیں۔ کیونکہ عبادت الٰہی کا مقدمہ یقین توحید ہے۔ پس دونوں جہتوں سے مومن و کافر کی عبادت میں اشتراک ممکن نہیں۔

اس مناسبت نفلی کے سبب صفت سے ماہیت موصوف کا پتہ چلتا

وسلام علی ابراھیم	وہ جاکہ سلامتی ہو ابراہیم پر
ولقد خلقنا فوقکم	اور ہم نے بنائے تمہارے اوپر سات
سبع طرائق وفتحنا	طبق
علیھم برکات السماء	اور کھولیں ہم نے ان پر برکتیں آسمان کی

مناسبت لفظ ومعنی کی مزید مثال۔

فاعل ہونے	اور	فعل کرنے کا فرق
۱۔ زید چور ہے		۵۔ زید نے گھڑی چرائی
۲۔ بکر عالم ہے		۶۔ بکر نے یہ بات سیکھی
۳۔ حاتم سخی تھا		۷۔ حاتم نے ایک گھوڑا بخشا
۴۔ نوشیرواں عادل تھا		۸۔ نوشیرواں نے یہ منصفانہ فیصلہ کیا

پہلے چار جملوں میں فاعل کی آمادگی واستعداد کا ذکر ہے۔ چور وہ ہو جس میں چوری کی آمادگی ہو یا عادت ہوگئی ہے وعلی ہذا

آخر چار جملوں میں فاعل کے محض ایک فعل کا ذکر ہے۔ جس سے عادت یا استعداد کا حاصل ہونا ثابت نہیں۔

قرآن مجید میں جب فاعل آئے گا اس کی آمادگی یا استعداد کی طرف اشارہ ہوگا اس فرق کو ملحوظ رکھو تو ذیل کی صورت کی مراد سمجھ میں آتی ہے ورنہ یہاں تکرار عبث اور حشو قبیح نظر آئے گا۔

قل یا ایھا الکافرون	کہدو کہ اے منکرو میں وہ عبادت
لا اعبد ما تعبدون ولا	نہیں کرتا جو تم کرتے ہو
انتم عابدون ما اعبد	اور نہ تم میں یہ استعداد ہے کہ
ولا انا عابد ما عبدتم	میری سے عبادت کرو
	اور نہ ہم میں یہ آمادگی کہ ہم تمہاری

۹۔ قال بمعنی وحی کی
۱۰۔ قال بمعنی الہام کیا
قرآن مجید ان مختلف معانی میں لفظ قال لاتا ہے اور مناسبت کی یہ کیفیت ہے کہ صرف متکلم اور مخاطب کے مرتبہ اور حیثیت سے قال کے معنی معلوم ہوجاتے ہیں۔ جیسے

۱۔ اذ قال اللہ یا عیسی انی متوفیك ورافعك الی۔
یہاں متکلم اور مخاطب کے مرتبے سے قال بمعنی وحی کی، معین ہوا۔

۲۔ قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراہیم۔ ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا الخ۔ یہاں آگ نہ سن سکتی ہے نہ سمجھ سکتی ہے۔ لہذا قلنا بمعنی نفاذ قدرت ہے۔

۳۔ اذا اراد شیئا فیقول لہ کن فیکون۔
یہاں شے موجود ہی نہیں جس سے کہا جائے۔ لہذا قال بمعنی ارادہ تخلیق کا کسی شے سے متعلق کرنا۔

اسی طرح وحی کے لغوی معنی اشارہ کرنا۔ لیکن متکلم اللہ اور مخاطب معصوم کی مناسبت سے اس کے چار معنی ہیں کہ ہر ایک اپنی جگہ معین ہو جاتا ہے۔
۱۔ الہام کیا۔ ۲۔ وحی کی۔ ۳۔ کلام من وراء الحجاب کیا۔ ۴۔ رویائے صادقہ میں ظاہر کیا۔

صفت اور موصوف کی مناسبت سے صفت کی مراد اس طرح معین ہوتی ہے۔

۱۔ ان اللہ علیم حلیم۔	بیشک اللہ علیم و حلیم ہے۔
۲۔ انا نبشرك بغلام علیم	ہم بشارت دیتے تجھکو ایک علیم لڑکے کی (مراد اسحاقؑ)
۳۔ یاتوك بکل ساحر علیم	لائیں تیرے پاس ہر ساحر علیم کو۔

ہے فعل سے فاعل کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ خطاب کرکے جو کچھ کہا گیا وہ بتادیا ہے کہ مخاطب کون ہے۔

مثالیں۔ (۱) فاعل کا پورا بیان ہو تو فعل کی نوعیت مشخص ہوتی ہے

نوٹ:۔ لفظ لغوی معنی کے علاوہ متعدد مجازی معنی سے صرف ہوا اور ہر جگہ فاعل کی نوعیت سے فعل کے معنی معین ہوتے ہیں:۔

۱۔ قال کے لغوی معنی زبان سے کہا۔

۲۔ چونکہ زبان سے کہنے کو سوچنا لازم ہے لہذا قال بمعنی دل میں خیال کیا جیسے۔ قال انی ظلمت نفسی (اس نے دل میں کہا کہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔

قالوا اتجعل فیہا من (ملائکہ نے) دل میں کہا کہ کیا تو ایسے

یفسد فیہا کو بنائیگا (خلیفہ) جو وہاں فساد کرے

چونکہ ملائکہ کے لئے قرآن مجید ناطق ہے کہ لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون یعنی ان کا قول وفعل رضائے الہی کے خلاف نہیں ہوتا۔ اس لئے قال بمعنی زبان سے کہا، نہیں ہو سکتا۔

۳۔ حکم دینے کو کہنا لازم ہے اس لئے قال مجازاً بمعنی حکم دیا آیا جیسے قال لا تختصموا لدی۔ حکم دیا کہ میرے سامنے جھگڑا نہ کرو۔

۴۔ کہنے سے پہلے ارادہ لازم ہے اس لئے قال بمعنی ارادہ کرنے کے آیا جیسے یقول لہ کن فیکون۔ وہ ارادہ کرتا ہے اس کا پس وہ ہو جاتا ہے۔

۵۔ ارادہ باری کو نفاذِ قدرت لازم ہے اس لئے قال بمعنی نفاذ قدرت آیا جیسے قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراھیم۔

۶۔ پوچھنے کو کہنا لازم ہے اس لئے قال بمعنی پوچھا آیا۔ جیسے قال فما خطبکم۔ وعلی ھذا

۷۔ قال بمعنی زبان حال سے کہا

۸۔ قال۔ بمعنی جواب دیا۔

اس اصل سے کئی ضابطے متفرع ہیں جن کی بحث ہم نے "استنباط الاحکام"
کی بحث میں آگے کی ہے۔

اب ہم اس بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ قرآن مجید چار جہتوں سے اعجاز ہے
اول اس کا جامع و مانع ہونا۔ اور اس جہت سے اعجاز ہونے اس کے ثبوت کو بھی قرآن
مجید نے آسان اور واضح کیا ہے۔ وہ اس طرح :۔
کلام کو جامع و مانع بنانے کے آٹھ اسلوب یا صنعتیں ہیں۔ وہ عقلاً منحصر ہیں
اور ان کا انہیں آٹھ میں محصور ہونا ثابت ہے۔ خداوند عالم نے قرآن مجید کی آٹھ متفرق
آیتوں میں کتاب کے جامع و مانع ہونے کا اثبات فرمایا ہے۔ اور ہر آیت جس رکوع
میں واقع ہے اس رکوع کی آیات کو ایک صنعت خاص سے جامع و مانع بنایا ہے دوسری
آیت کے رکوع کو دوسری صنعت سے تیسری آیت کے رکوع کو تیسری صنعت سے وعلیٰ
ہذا آخر تک۔ اس طرح تمام ممکن صنعتوں کا احصار کر لیا ہے۔

جامع و مانع کلام وہ ہے جس کی عبارت اپنی مراد پر ٹھیک ٹھیک دلالت
کرے نہ تو مراد سے کم ظاہر ہو نہ زائد۔ یعنی کلام متعدد معانی کا محتمل نہ ہو یہ خوبی ہے
اس کی ضد ابہام ہے۔ وہ عیب کلام ہے مبہم کلام وہ ہے جس کے دو یا زیادہ
معنی ہو سکیں اور پتہ نہ چلے کہ قائل کی مراد کون سے معنی ہیں۔
مبہم کلام ایسا معیوب ہے کہ اس میں کوئی معنوی وصف نہیں ہو سکتا۔ علماء
اسلام سے تعجب ہے کہ ایک طرف وہ قرآن کو نہایت فصیح و بلیغ بھی مانتے ہیں اور
بلاغت کو جامع و مانع ہونا لازم ہے۔ دوسری طرف قرآن کو مبہم اور ناقص الدلالت
مانتے ہیں۔ یہ اجتماع ضدین۔ سچ ہے کہ ہر تقلیدی مذہب عقائد اضداد کا مجموعہ
ہے۔

لفظ "علیم" مختلف موصوفین کے لئے آیا ہے اور ان کی صلاحیت سے علیم کے معنی معین ہیں۔ اللہ تعالیٰ ذات کامل ہونے سے ان کے لئے علیم بمعنی عالم مطلق ہے۔ حضرت اسحاق ؑ کے لئے بمعنی علم و آگہی بحرفت اللہ علم شریعت ساحر کے لئے علیم یعنی علم سحر میں مہارت ہے۔ لفظ وحی کی مراد مخاطب کی حیثیت سے اس طرح معین ہوئی ہے۔

۱۔ سورہ مریم۔

فاوحی الیھم ان سبحوا — پس اشارہ کیا (زکریا) نے کہ تم تسبیح کرو (لغوی معنی)

اس محل پر حضرت زکریا بوجہ صائم ہونے کے کلام نہ کرسکتے تھے۔

۲۔ واوحینا الی ام موسی — رویائے صادقہ میں ظاہر کیا۔

۳۔ واوحی ربك الی النحل — اور وحی کی تیرے رب نے شہد کی مکھی کو

یہاں اوحی بمعنی شعور حیوانی یا اقتضاء فطرت کی تحریک

۴۔ زلزلت۔ بان ربك اوحی لھا — اس لئے کہ تیرے رب نے وحی کی اس (زمین) کو

وحی بمعنی قوائے فطریہ کو عامل کیا جس سے اپنے اقتضاء فطرت کے مطابق کیفیت قبول کی۔

ان مثالوں سے ایک اہم ضابطہ حاصل ہے۔ وہ یہ کہ قضیہ میں موضوع اور محمول دونوں ایک دوسرے کی تحدید کرتے ہیں

پس قضیہ کی مراد سمجھنے کو نظر کرنا ہوگی کہ کس موضوع میں محمول کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے اس طرح موضوع کی صحیح مراد متعین ہوگا اور کبھی یہ کہ محمول کس حد تک موضوع کا صادق ہے اس طرح محمول کی مراد معین ہوگی۔

اور مخاطب لازم ہے اور ان کی حیثیت اور روش (مثلاً لہجہ) سے کلام کی مراد معلوم ہوتی ہے۔ یہ دونوں کلام کے قرینہ حالی کہلاتے ہیں اگر کلام کی غرض پہلے سے معلوم ہوجائے تو وہ بھی قرینہ حالی ہوتی ہے۔ مثلاً لفظ 'آدمی' کے اصلی معنی انسان۔ مجازاً شوہر یا خادم کے لئے آتا ہے اور ہر کلام میں اس کی مراد قرائن سے معین ہوتی ہے۔ جیسے

۱۔ مریم نے کہا میں باہر نہ جاؤں گی میرا آدمی ناراض ہوگا۔

۲۔ نواب صاحب! حضور کا آدمی حاضر ہے اور باہر کھڑا ہے۔

اول مثال میں متکلم کی حیثیت کہ وہ عورت ہے اور 'میرا آدمی' میں اس کی ذات سے آدمی کی تخصیص بتاتی ہے کہ آدمی سے مراد شوہر ہے

دوسری مثال میں مخاطب کا مرتبہ کہ وہ نواب ہے اور 'اس کے آدمی' میں تخصیص بتاتی ہے کہ 'آدمی' سے مراد خادم ہے

دلالت کے اعتبار سے کلام کی تقسیم۔ (۱) جامع و مانع (۲) مبہم جامع و مانع کلام کی دو قسمیں ہیں (۱) بین بنفسہ (۲) توضیح طلب۔

بین بنفسہ وہ کلام ہے جس کی مراد بلا تامل حاصل ہو۔

توضیح طلب وہ کلام جس کی مراد سمجھنے کو غور و فکر کرنا پڑے اور دوسرے کلام سے اس کی توضیح ہوجائے۔

عموماً ایک دوسرے سے بات کرنے میں لوگ ایک دوسرے کا مطلب بلا تامل سمجھتے جاتے ہیں اور گفتگو میں بین بنفسہ کلام اکثر آتا ہے جیسے محمود سو رہا ہے۔ شور نہ کرو۔ میں خط لکھ رہا ہوں بعد اسکے تمھارے ساتھ چلوں گا

موضوع قرآن پر کلام کے جامع و مانع ہونے کا اشکال

الہیات اور قوانین موضوع قرآن ہیں۔

الہیات میں بکثرت ایسے تصورات سے بحث ہے جن کے لئے محاورہ عام

لفظ کے متعدد معانی ابتداءً ہر شے کے لیے ایک خاص لفظ بولا گیا۔ جیسے لفظ شیر۔ پانی۔ پیلنا۔ بیٹھنا دریا۔ ان کے معنی ظاہر ہیں۔ ایسے معنی کو وضع لغوی کہتے ہیں۔

رفتہ رفتہ یہی لفظ اس شے کے لیے بھی بولے گئے جو لغوی معنی کو لازم تھے یا اس کا جز تھے۔ جیسے شیر میں جرات پائی جاتی ہے تو شیر معنی جری بولا گیا جیسے رستم ایک شیر تھا۔ دریا کو وہ جگہ لازم ہے جس میں وہ بہتا ہے تو دریا کا لفظ مجری کے لئے بھی دریا بولا گیا۔ پانی شفاف ہے تو پانی بمعنی چمک اور رونق بھی بولا گیا۔ عام طور پر جب ایسے مجازی معنی بولے جانے لگے تو وہ معنی وضع عرفی کہلائے واضح رہے کہ مجازی معنی کو لغوی معنی سے ایک علاقہ خاص ہوتا ہے یعنی یا تو وہ لغوی معنی کا جز ہوتا ہے یا اس کے ساتھ ہمیشہ پایا جاتا ہے یعنی لازم ہوتا ہے۔ مثلاً لفظ "بند" فارسی میں اصلاً بمعنی باندھنے کے تھا۔ بعد کو وہ ایسی شے کے لئے بولا گیا جس سے باندھا جائے یا باندھنے سے جو صورت حاصل ہو چنانچہ بند کے اتنے معنی ہو گئے۔

(۱) زنجیر قید (۲) قفل (۳) بند قبا (۴) اعضا کے جوڑ (۵) کشتی کا پیچ (۶) قید (۷) اشعار کا بند جیسے ترکیب بند (۸) وہ پشتہ جو دریا کا پانی روکے۔ وغیرہ۔

تعریف۔ لفظ کے اصلی معنی کو حقیقت کہتے ہیں اور مجازی معنی کو مجاز۔ ہر صورت میں لفظ کے مرادی معنی سیاق و سباق سے اور قرائن مراد سے معین ہوتے ہیں۔

قرائن مراد کی تعریف۔ کلام کا قرینہ وہ امر ہے جو کلام کا لازم ذات ہو۔ اس کی کیفیت کلام کی مراد کی طرف اشارہ کرے۔ اگر کلام مسلسل اور مربوط ہو تو ہر جملہ کا سابق کلام اور لاحق یعنی بعد کے جملے اس کا قرینہ مقالی کہلاتے ہیں کیونکہ ان سے اس جملہ کی مراد معین کرنے میں مدد ملتی ہے کلام کو متکلم

کیا ہے۔

بحث اوّل ۔ جو کتاب حکیم مطلق کی طرف سے ہدایت کے لئے آئے اس کا جامع و مانع ہونا ضروری ہے کیونکہ مبہم کلام بجائے ہدایت کے ضلالت کا سبب ہوگا اور حکیم مطلق سے ایسے فعل کا صدور محال ہے۔ اور سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان آیات کی تفسیر میں ہم دکھادیں گے کہ آیت کی مراد یہ ہے اور اس کے خلاف کوئی معنی تجویز کرو تو قرآن اس کو رد کرتے ہیں۔

دوسری بحث قرآن مجید کا دعویٰ — ذیل کی آٹھ آیات میں قرآن مجید کے جامع و مانع ہونے کا دعویٰ ہے۔

۱۔ یس ۔ والقرآن الحکیم	یہ محکم قرآن شاہد ہے کہ۔۔۔۔
۲۔ یونس ۔ تلک ایات الکتاب الحکیم	یہ محکم کتاب کی آیات ہیں
۳۔ ھود۔ کتاب احکمت ایاتہ ثم فصلت	ایک کتاب ہے جسکی آیات محکم کر دی گئی ہیں اور کھول دی گئی ہیں
۴۔ لقمان ۔ تلک ایات الکتاب الحکیم	یہ محکم کتاب کی آیات ہیں
نساء۔	
۵ ۔ افلا یتدبرون القرآن	پھر کیوں نہیں تدبر کرتے قرآن میں اگر
ولو کان من عند غیر اللہ	وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو
لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا	اس کے بارہ میں کثیر اختلاف پاتے۔
ال عمران	
۶۔ ھو الذی انزل علیک الکتاب	وہ ہی ہے جس نے نازل کی تجھپر کتاب
بالحق۔ منہ ایات محکمات	جیسی کہ چاہیئے۔ اسمیں محکم آیات ہیں
ھن ام الکتاب	اور وہ احکام کا ماخذ ہیں
ال عمران	
۷ ۔ ذالک نتلوہ من الایات	یہ محکم آیات اور ذکر ہم

میں ابتداءً سے الفاظ نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ جیسے جوہر۔ عرض۔ قدیم۔ حادث
یہ الفاظ زبان میں دوسرے لغوی معنی رکھتے تھے۔ الٰہیات میں ان کے اصطلاحی
معنی مقرر ہوئے۔ قوانین میں احکام کے لئے فعل کا اور شئے کا معین مفہوم لانا
پڑتا ہے تاکہ فرائض و حقوق کا تعین ہو سکے۔

محاورہ عام کے الفاظ متعدد معانی کے محتمل۔ اس لئے اصطلاحات و
تعریفات ضروری۔ جیسا کہ طلباء فقہ یا قوانین ملکی پر عیاں ہے اور باوجود صرف
اصطلاحات بھی الٰہیات و قوانین میں جا بجا کلام متعدد معانی کا محتمل رہ جاتا ہے۔
اس لئے قرآن مجید صرف محاورہ عام کو صرف کرے۔ کوئی اصطلاح نہ لائے
اور پھر بھی پورے طور پر جامع و مانع رہے تو حیرت انگیز بات ہے لیکن قرآن
مجید کے بیان میں ایجاز (اختصار) کا بحد کمال ہونا پھر جملوں کا مرصع و مسجع ہونا
(یعنی جملوں کا تقریباً ہموزن ہونا اور مقفی ہونا) اور فصاحت کا التزام اس بات کو
اور بھی مشکل کرنے والا ہے کہ کلام جامع و مانع ہو پس ان احوال میں قرآن مجید
کا جامع و مانع ہونا یقیناً اعجاز ہے۔

انشا پردازوں پر یہ بات بالخصوص عیاں ہوگی کہ مقفی اور مرصع
عبارت میں نہایت اختصار عبارت کے ساتھ اور زبان فصیح میں مسائل
فقہ اور الٰہیات پر بلا صرف اصطلاحات تحریر کرنا طاقت بشری سے باہر ہے

قرآن مجید کا جامع و مانع ہونا

اس بحث میں ہم تین باتیں ثابت کریں گے۔ اول یہ کہ قرآن مجید
جامع و مانع ہے۔ دوم یہ کہ قرآن مجید نے آٹھ مختلف آیات میں جامع و مانع
ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ سوم یہ کہ ان آٹھ آیتوں میں سے ہر آیت کے بعد کی
آیات کو ایک صنعت خاص سے جامع و مانع بنایا ہے۔ کلام کو جامع و مانع بنانے
کی عقلاً آٹھ صنعتیں ہو سکتی ہیں ان میں ہر صنعت کو ایک ایک رکوع میں صرف

بقرہ - ۲۲ -

فبعث اللہ النبیین مبشرین	پس مبعوث کیا اللہ نے مبشر و منذر
و منذرین و انزل معھم	نبیوں کو اور ان کے ساتھ نازل کی
الکتاب بالحق لیحکم بین	کتاب بیان حق کے ساتھ تاکہ وہ
الناس فیما اختلفوا	فیصلہ کرے لوگوں کے درمیان اس
فیہ وما اختلف فیہ	بات میں جس میں انہوں نے اختلاف
الا الذین اوتوہ من بعد ما	کیا حق سے اور نہیں لوگوں نے یہ
جاءتھم البینٰت بغیا	اختلاف کیا جن کو وہ دی گئی تھی ایک
بینھم فھدی اللہ	دوسرے پر زیادتی کرتے ہوئے بعد
الذین امنوا لما اختلفوا	اس کے کہ ان کے پاس واضح آیات
فیہ من الحق باذنہ	پہونچیں ۔ تو اللہ نے مومنین کی
	ہدایت کی اپنے اذن سے اس کے
	بارہ میں جس میں لوگوں نے اختلاف
	کیا حق سے ۔

ان آیات میں فرمایا کہ وہ آیات بینات تھیں یعنی واضح پھر بھی اہل کتاب نے ان میں اختلاف کیا (ان کی واضح مراد سے) پھر آخر کلام میں اس کو صاف صاف فرما دیا کہ اختلاف کیا انہوں نے حق سے ۔

ذیل کی آیت میں اور زیادہ صاف تصریح کی ہے کہ اختلاف از حق ہے ۔

اولٰئک الذین اشتروا	یہ وہ ہیں جنہوں نے ہدایت
الضلالۃ بالھدی	کے بدلے میں ضلالت کو خرید کیا
والعذاب بالمغفرۃ ۔	اور مغفرت سے عذاب کو (خریدا)
فما اصبرھم علی النار	تو وہ کیا ہے جس نے ان کو نار
ذلک بان اللہ نزل	جہنم کا محتمل کیا ہے ؟

وذکر الحکیم — پڑھ کر سناتے ہیں

۸ فاذا انزلت سورۃ محکمۃ — اور جب محکم سورہ اتارا گیا

لغت میں محکم کے معنی مضبوط یا جچا ہوا۔ ان میں سے جو معنی جچا ہوا اختیار کرو محکم کلام وہ ہی ہوا جو قطعی الدلالت ہو۔ یعنی جو مطلب ادا کیا وہ مضبوط ثابت ہو اور الفاظ کی دلالت معنی پر قطعی ہو کلام جامع و مانع ہو اس کے خلاف ہو تو کلام کو نہ مضبوط کہہ سکتے ہیں نہ جچا تلا کہہ سکتے ہیں

پس قرآن کی آیات کے لئے دو امر ثابت کئے ہیں ایک یہ کہ الفاظ معنی پر قطعی الدلالت ہیں یعنی کلام جامع و مانع ہے اور آیات کے مطالب ثابت ہیں یعنی یا تو وہ بدیہی ہیں یا ان کے دلائل موجود ہوں۔ ہم پہلے آیات کے جامع اور مانع ہونے پر بحث کریں گے اس کے بعد ان کے مدلل ہونے پر جدا بحث کریں گے۔

سورۂ نساء کی آیت میں قرآن مجید کا جامع و مانع ہونا دوسرے لفظوں میں بیان ہوا۔ یہاں یہ فرمایا کہ تدبر کرو تو قرآن مجید کی آیات کے بارہ میں اختلاف نہ پاؤ گے۔ افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔

آیات قرآن کا محل اختلاف نہ ہونا ان کا جامع و مانع ہوتا ہے۔

سورہ نساء اور شوریٰ میں جامع و مانع کلام کی تعریف دوسرے الفاظ میں کی ہے۔ یہاں بجائے حکیم اور محکم کے فرمایا کہ یہ کلام اختلاف کا محتمل نہیں ہے۔ اور یہاں ایک عجیب صنعت سے کلام کو جامع و مانع بنایا ہے۔ یعنی لفظ اس طرح جملہ میں لائے کہ اس کے جتنے معنی یہاں لگ سکتے ہیں ہر معنی سے وہی حقیقی مراد ظاہر ہوتی ہے یہ بدیع معجزہ ہے سوائے قرآن کے اور کسی کلام میں نہیں پائی جاتی اختلاف کے لغوی معنی ہیں پیچھے رہ جانا۔ اس لئے مراد تک نہ پہونچا اختلاف ہوا۔ آیات کی مراد حق ہے۔ اس لئے اختلاف از حق ہوا جیسا کہ ذیل کی آیات سے ظاہر ہے

تو مزید اس کے بارہ میں اختلاف پاتے

۱۔ اس آیت میں جس قدر لفظ آئے ہیں سوائے لفظ اختلاف کے سب
ایک ہی معنی کے محتمل ہیں۔ اور لفظ اختلاف کے جتنے لغوی معنی یہاں لگ سکتے ہیں
سب سے ایک ہی مراد لازم آتی ہے۔

۲۔ لغت میں اختلاف کے چار معنی ہیں (۱) ناموافقت کرنا یعنی پیچھے رہ
جانا (۲) سامنے سے آنا (۳) ساتھ ساتھ اندر آنا (۴) دست آنا۔ چونکہ
اس محل پر کتاب اور اس کی تعبیر کا ذکر ہے اس لئے معنی (۲) اور (۴)
یہاں نہیں لگتے۔ معنی (۱) اور (۳) لگتے ہیں ایک ساتھ ساتھ در آنا اس
معنی کے ساتھ کلام کے دو معنی پیدا ہوئے یعنی مبہم ہونا۔ اور یہی معنی یہاں
مراد ہیں۔ دوسرے معنی ناموافقت کرنا۔ یعنی حقیقی مراد پر قطعی دلالت نہ کرنا
اس کے بھی وہی معنی ہوئے کہ مبہم ہے۔

اگر کہا جائے کہ اختلاف کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کا ایک بیان دوسرے کے
مخالف نہیں ہے تو بھی حقیقی مراد لازم آتی ہے اس لئے کہ تضاد انہیں دو بیانوں
میں ہو سکتا ہے جو جامع و مانع ہوں۔ اگر ایک بیان مبہم ہو یعنی اس کے دو معنی ہو
سکیں تو تضاد ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے زید ہمارا بھائی ہے۔ اور زید سے ہمارا
خاندانی رشتہ نہیں۔ یہ دو بیان متضاد نہیں۔ اس لئے کہ اول بیان کہ زید
ہمارا بھائی ہے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک خونی رشتہ دوسرے برادر ملت۔ پس
اس تقدیر پر بھی کلام کا جامع و مانع ہونا یا محلِ اختلاف نہ ہونا لازم آیا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ ناموافقت نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ کل قرآن اپنی
وضع و دلالت میں یکساں ہے تو بھی وہی معنی لازم آتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن
کے بعض بیانوں کا بیّن بنقسم ہونا اور اس لئے جامع و مانع ہونا عیاں ہے
پس اگر کل بیان کا ایک ہی اسلوب ہے تو کل بیان جامع و مانع ہے۔ اس
آیت میں لفظ 'اختلاف' کا یہ محیر العقول صرف ہے۔ اس آیت کی تصریف

الکتاب بالحق وان الذین اختلفوا فی الکتاب لفی شقاق بعید

(یعنی ان کو عذاب جہنم ہوگا) یہ (عذاب) اس لئے ہے کہ اللہ نے کتاب جیسی چاہیئے نازل کی (یعنی جامع ومانع و واضح) اور کتاب میں اختلاف کرنے والے دور کی ضلالت میں ہیں۔

۱۔ اس آیت نے سب اختلاف کرنے والوں کو گمراہ بتایا ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اختلاف سے مراد اختلاف از حق ہو ورنہ مجرد اختلاف تو اہل حق اور اہل باطل کے مابین بھی ہو سکتا ہے۔ پس اگر آیت میں اختلاف سے مجرد اختلاف آراء مراد ہو تو اہل حق اور اہل باطل سب کا گمراہ ہونا لازم آتا ہے جو بداہۃً محال ہے۔ لہذا ثابت ہے کہ اختلاف مبنی اختلاف از حق ہے

۲۔ اس آیت میں عذاب کا درست ہونا اس وجہ سے بتایا ہے کہ کتاب جیسے چاہیئے ویسی ہے (یعنی جامع ومانع و واضح) کہ اسی صورت میں غلط تعبیر کرنے والوں پر عذاب حق بجانب ہو سکتا ہے۔ ورنہ اگر کتاب خود ہی مبہم اور ناقص الدلالت ہو تو پھر غلط تعبیر پر عذاب کیسا؟

قرآن مجید کے جامع ومانع ہونیکا دعویٰ اور اس جہت سے اس کا اعجاز ہونا

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا

پھر کیوں نہیں تدبر (غور وفکر) کرتے قرآن میں؟ درحالیکہ اگر وہ سوائے اللہ کے کسی اور کی طرف سے ہوتا

سکتے ہو) یا تمہارے اختلاف کرنے کی سزا کا حکم کتاب میں ہے۔ دونوں معنوں سے وہی مراد لازم آتی ہے۔ حکم سزا کے ساتھ پوری آیت اس طرح ہے:

وما اختلفتم فیہ من شیء فحکمہ الی اللہ ذالکم اللہ ربی علیہ توکلت والیہ انیب	اور جو ناموافقت کی تم نے اس میں کچھ بھی (خواہ وہ اس کا حکم ہو یا حقیقی مراد) تو فیصلہ اس کا (سزا یا حقیقی مراد) کا اللہ کے ہاتھ ہے یہ ہے اللہ میرا رب (حکم سزا بتلانے والا یا صحیح مراد بتانے والا) تو اسی حکم و فیصلہ پر میرا توکل و رجوع ہے (یا اسی اللہ پر میرا توکل و رجوع ہے)

اس کلام نے صورت اعجاز اختیار کی ہے۔ اس کے ہر جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور ہر معنی سے دوسرے معنی لازم آتے ہیں۔ اس طرح کلام کو جامع و مانع بنایا ہے۔ ان جملوں میں ہر دو معنی کا لزوم اس طرح عیاں ہے کہ قرآن کے حکم سے اختلاف کرنے کو لازم ہے کہ اس کی حقیقی مراد سے اختلاف کیا جائے۔ اور حقیقی مراد سے اختلاف کرنے کو لازم ہے کہ حکم سے اختلاف کیا جائے۔

فحکمہ الی اللہ کے دونوں معنوں میں باہم لزوم۔ اگر اختلاف کرنے کی سزا کا حکم موجود ہے تو آیت کی صحیح مراد کا فیصلہ بھی ضرور آیت سے حاصل ہوگا ورنہ حکم بے جا ہوگا۔ اور اگر آیت کی صحیح مراد کلام سے حاصل ہے یہ ربانی کلام ہے۔ تو ضرور آ سے اختلاف کی سزا بھی ہے جو کتاب میں ہونا چاہیئے

ذالکم اللہ ربی کے دو معنوں میں لزوم۔

اگر اللہ نے اختلاف کی سزا بتائی ہے تو ضرور ہے کہ وہ کلام کی صحیح

سورہ شوریٰ میں آئی ہے اور اس میں بھی یہ بدیع معجزہ موجود ہے اس کو ہم ابھی بیان کریں گے۔ پہلے اس آیت کے ایجاز اور کثرت معانی سے اس کا اعجاز ظاہر کرتے ہیں۔ یہ آیت حسب ذیل نو مطالب پر دلالت کرتی ہے:

۱۔ یہاں استفہام سے زجر پر دلالت کی ہے۔ دیکھ کیوں نہیں تدبر کرتے، تدبر نہ کرنے پر ملامت و زجر ہے۔ لہذا تدبر فی القرآن واجب ہے۔

۲۔ تدبر سے اس کی حقیقی مراد اس کا جامع و مانع ہونا ظاہر ہوگا۔

۳۔ اور یہ امر اس کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے اس لئے کہ اعجاز ہے کوئی اور سے کلام پر قادر نہیں ہو سکتا۔

۴۔ اگر کسی اور کا یہ کلام ہوتا تو اس کا موضوع ایسا ہے کہ وہ بالضرورت مبہم ہوتا۔

۵۔ جن لوگوں نے تدبر نہیں کیا انہوں نے اس کے غلط معنی لگائے۔

۶۔ تدبر کے معنی حصول مقصود کے صحیح وسائل اختیار کرنا۔ پس مراد یہ ہوئی کہ غور و فکر سے صحیح قواعد تفسیر پر پہونچو۔

۷۔ اس لئے ظاہر ہوا کہ جو غلط معنی لگاتے ہیں وہ غلط قاعدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

۸۔ صحیح قواعد تعبیر سے اس کی حقیقی مراد حاصل ہے۔

۹۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو قرآن میں تدبر نہیں کرتے جن پر زجر وارد ہوا مذکورہ بالا آیت کی تصریف۔

شوریٰ۔

وما اختلفتم فیه من شيءٍ فحکمه الی الله	اور جو نا اتفاق کرو تم اس سے (کتاب کے کسی بیان سے) تو اس کا حکم اللہ کی طرف سے ہے

یعنی وہ حکم الٰہی کتاب میں ہے (یعنی حقیقی مراد کہ تدبر سے اس تک پہونچ

پس کلام کے جامع و مانع ہونے کی ایک صورت تو یہ ہوئی کہ ایسے جملے اختیار کئے جائیں جس کے ہر لفظ کے ایک ہی معنی جملہ میں لگ سکیں تو ایسا کلام بیّن بنفسہ ہوگا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مربوط کلام میں اس مبہم لفظ کو کئی جملوں میں پے در پے اس طرح صرف کیا جائے کہ اس کے مرادی معنی ظاہر ہو جائیں مثلاً ایک جملہ میں وہ لفظ دو معنی کا محتمل تھا اور دوسرے جملہ میں وہ لفظ ان دو میں سے ایک معنی کا محتمل نہ رہا صرف ایک ہی معنی وہاں لگے تو معلوم ہو گیا کہ یہی مراد ہے تیسرا طریقہ۔ ایک لفظ کو جملہ میں اس طرح صرف کرنا کہ لفظ کے جتنے معنی وہاں لگ سکیں سب سے ایک ہی مراد لازم آئے۔ یہ بدیع معجز ہے۔ چوتھا طریقہ۔ غرض کلام ایک قرینہ حالی ہے۔ اگر وہ ابتدائے کلام میں ظاہر ہو جائے کہ متکلم کس مطلب پر گفتگو کر رہا ہے تو بعد کے جملوں کی مراد اسی مطلب کی طرف پھیری جائے گی اور ابہام رفع ہو جائے گا۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ ایک مطلب کو بیان کیا جائے اور بعدہ اس مطلب کی ضد کا ذکر لایا جائے تو مراد معین ہو جائے گی۔
ان طرق کے علاوہ ربط کلام سے مراد معین کرنے کے تین طریقے ہیں۔ واضح ہو کہ مربوط کلام میں جملوں کے ربط کی تین ہی قسمیں ہیں۔

(۱) علاقہ تقریر۔ (۲) علاقہ تغیئر۔ (۳) علاقہ تفسیر۔

علاقہ تقریر (بمعنی مقرر کرنا)۔ جب ایک جملہ دوسرے پر تاکید لائے یا اس کی علت و سبب بیان کرے تو دونوں جملوں میں علاقہ تقریر ہوا۔

علاقہ تغیئر۔ یعنی ایک جملہ دوسرے کے معنی میں کسی قدر تغیر پیدا کر دے تو دونوں میں علاقہ تغیر قائم ہوا۔ اس کی چار صورتیں ہیں

۱۔ استثنا اور مستثنیٰ منہ

۲۔ شرط و جزا

۳۔ جملہ حالیہ جو دوسرے کا حال بتائے

۴۔ استدراک یعنی ایک جملہ میں دوسرے کا جزئی رد ہو

مراد کا ظاہر کرنے والا بھی ہو۔ اور اگر کلام کی صحیح مراد ظاہر کی ہے تو اختلاف کی سزا بھی ضرور بتائی ہے۔

علیہ توکلت والیہ کے دو معنوں میں لزوم۔

اللہ کے بیان اور حکم پر توکل و رجوع یعنی اللہ پر توکل و رجوع ہے اور اللہ پر توکل و رجوع کو لازم ہے کہ اس کے بیان اور حکم پر توکل و رجوع ہو۔

اختلاف کرنے کی سزا کا حکم

شوریٰ۔ وما تفرقوا الا	اور وہ اختلاف کرنے والے
بعد ما جاءتھم	ہوئے صرف بعد اس کے کہ ان
علم بغیا بینھم	کے پاس علم پہونچا (یعنی کتاب آگئی)
ولولا کلمۃ سبقت	بسبب باہمی عناد کے
من ربک الی اجل	اور اگر تیرے رب کا حکم ایک
مسمی لقضی بینھم	زمانہ معین تک کی (مہلت)
	کا نہ ہوتا تو ان کا فیصلہ ہوچکا ہوتا

یعنی بوجہ ابتلا کے لوگوں کو ایک معین مدت (زمانہ حیات) تک مہلت نہ ہوتی تو ان کو اسی حیات میں سزا ملتی۔ اس لیے ان کی سزا اس مہلت کے بعد ہوگی۔

کلام کو جامع ومانع بنانے کے اسلوب

عموماً الفاظ کئی کئی معنی سے بولے جاتے ہیں۔ پس اگر کوئی ایسا لفظ جملہ میں آجاتا ہے اور اس جملہ میں اس لفظ کے دو یا زیادہ معنی لگ بھی سکتے ہیں تو وہ جملہ مبہم ہوجاتا ہے۔ اور اوپر کی بحث سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ایک لفظ کے سب مختلف معانی ایک جملہ میں نہیں لگ سکتے جیسے لفظ اختلاف کے چار معنی میں سے صرف دو ہی وہاں لگ سکے۔

متکلم کے مرتبہ وشان کی تصریح وارد ہے کہ وہ قادر ورحیم ہے (نزول قرآن میں باب الرحمت ہے) مخاطب اول یعنی نبیؐ کی خصوصیت بیان ہوئی کہ وہ عین صراط مستقیم پر ہیں یعنی معصوم ہیں اور رسول ہیں۔

باقی مکلفین جو مخاطب قرآن ہیں ان کو عذاب آخرت سے ڈرایا جارہا ہے پس تینوں اصول دین یعنی ایمان باللہ۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد کا ذکر یہاں وارد ہے اور یہی تینوں قرآن حالی ہیں۔

تیسری صنعت سورہ یونس۔ یہاں علاقۂ تفسیر سے کلام کو جامع ومانع بنایا ہے۔ پہلے اجمالی ذکر آتا ہے بعدہ اس کی تفصیل ہے۔

(۱) تلک آیات الکتاب الحکیم	یہ آیات ہیں کتاب محکم کی	آیات کے جامع ومانع ہونا۔ آیات کا اجمالی بیان
(۲) اکان للناس عجبا	کیا لوگوں کو تعجب ہوا۔	اس کے آگے تعجب کی تفصیل اس میں ہے اور اس کا رد عمل (۷) میں ہے۔
(۳) ان اوحینا الی رجل منھم	کہ ہم نے انھیں میں سے ایک مرد پر وحی کی	وحی اجمال ہے آگے کیا وحی ہوئی اس کا بیان (۴) اور (۵) میں ہے۔
(۴) ان انذر الناس	کہ لوگوں کو ڈرائے	کس بات سے ڈرانے (۱۳) میں آتا ہے۔
(۵) وبشر الذین امنو	اور بشارت دے مومنوں کو	کیا بشارت دے اس کا بیان (۶) میں ہے۔
(۶) ان لھم قدم صدق عند ربھم	کہ ان کی رب کی نظر میں ان کی روش راست ہے۔	
(۷) قال الکافرون		

علاقۂ تفسیر۔ مثلاً ایک جملہ میں اجمال دوسرے میں اس کی تفصیل ہو تو علاقۂ تفسیر ہوا۔ قرآن مجید کی آٹھ سورتوں میں یہ بیان آیا کہ قرآن مجید جامع و مانع ہے اور اس بیان کے بعد ہی جو آیات ہیں ان میں ایک خاص اسلوب سے کلام کو جامع اور مانع بنایا ہے۔ دوسرے مقام پر دوسرے اسلوب سے۔ تیسرے مقام پر تیسرے اسلوب سے وعلیٰ ہذا۔ اس طرح مذکورہ بالا آٹھوں اسالیب کو صرف کیا ہے۔ ایک خاص صنعت یعنی بدیع معجز جو قرآن مجید سے مخصوص ہے اس کی بحث ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اسی آیت میں قرآن مجید کے جامع و مانع ہونے کے بنا پر اس کے اعجاز کا دعویٰ بھی ہے۔

دوسری صنعت۔ سورہ یٰسٓ کے پہلے رکوع میں جامع و مانع ہونے کا دعویٰ ہے اور وہاں آیات کو بین بنغمہ رکھا ہے۔

۱۔ یٰسٓ۔ والقرآن الحکیم	یہ محکم قرآن شاہد ہے
۲۔ انک لمن المرسلین	کہ تو مرسلین میں ہی سے ہے
۳۔ علیٰ صراط مستقیم	صراط مستقیم پر ہے
۴۔ تنزیل العزیز الرحیم	جو آتا رہا ہوا قادر و رحیم کا ہے
۵۔ لتنذر قوما ما انذر	تاکہ ایک ایسی قوم کو ڈرایا جائے جنکے
اباؤھم فھم غافلون	ابا نہیں ڈرائے گئے پس وہ غافل ہیں
۶۔ لقد حق القول علیٰ	ان میں سے اکثر پر قرآن کا حق ہونا
اکثرھم فھم لا	ثابت ہوا ہو پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے
یومنون	

القول قرآن مجید کا ایک نام ہے جو قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے اور چونکہ آیت میں تصریح ہے کہ ان کو قرآن مجید کے ذریعہ سے نبی ڈرائیں لہٰذا وہ قول دعوت بھی قرآن ہی ہوا۔ ان آیات میں آیات قرآن کے قرآن حالی کا ذکر بھی ہے

واعملوا الصالحات	اور عمل صالح کرنے	اور قدم صدق کا لازمی نتیجہ
بالقسط	والوں کو عدل کے	ہے۔
(۱۶) والذین کفروا	ساتھ۔ اور جنھوں	
لهم شراب من	نے کفر کیا انکے لیے ہے	
حمیم وعذاب	گرم پانی پینا اور دردناک	
الیم بما کانوا	عذاب سزا میں انکے کفر کے	
یکفرون		

استوی علی العرش۔ تخت پر بیٹھا۔

بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے کو نفاذ حکومت لازم ہے۔ یہاں ظاہری معنی سے تجسم لازم آتا ہے جو محال ہے۔ لہذا مجازی معنی مراد ہوئے یعنی اللہ کا تصرف نافذ ہوا۔ قرآن مجید میں لفظ کرسی بھی آیا اس کے معنی بھی تخت ہیں۔ قرآن مجید میں دونوں لفظ ایک ہی معنی سے آئے ہیں جیسا کہ ذیل کی آیات سے ظاہر ہے۔

وسع کرسیه السموات	اس کی حکومت کی وسعت آسمانوں اور
والارض وهو رب العرش	زمین تک ہے اور مالک عظیم حکومت
العظیم۔	کا۔

چوتھی صنعت۔ علاقہ تغیر سے کلام کو جامع ومانع بنانا۔ اس علاقہ کی چار نوع ہیں۔ شرط وجزا۔ استثنا ومستثنیٰ منہ جملہ حالیہ سے ربط اور استدراک۔ ان سب کا یہاں صرف ہے۔ سورہ ہود کے پہلے رکوع میں اس صنعت کا صرف ہے۔

(۱) کتاب احکمت ایاته	یہ ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم
ثم فصلت من لدن	کر دی گئی ہیں اور کھول دی گئی
حکیم خبیر	ہیں جو حکیم وخبیر کے پاس سے آئی ہیں

آیت	ترجمہ	تشریح
ان هذا لساحر مبین	کافروں نے کہا کہ یہ کھلا جادوگر ہے۔	یہ انذار کا رد عمل ہے اس باطل خیال کا رد جا بجا ہے۔ وہ آگے (۸) میں ہے۔
(۸) ان ربکم الله الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام	تمہارا رب تربیت کرنے والا اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ زمانوں میں خلق کیا	کفار کے قول کا رد یہ ہے کہ اللہ تمہارا تربیت کرنے والا ہے اور نزول کتاب تربیت کے لیے ہے۔
(۹) ثم استوی علی العرش یدبر الامر	پھر نافذ کیا اپنی حکومت کو کہ انتظام کا کرے	یعنی نظام عالم مقصد تربیت کی طرف راجع ہے اس لئے نزول کتاب و رسول جائے تعجب نہیں ہے۔
(۱۰) ما من شفیع الا من بعد اذنه	کوئی شفیع نہ ہوگا مگر بعد اس کے اذن کے	پس نجات موقوف ہے اطاعت پہ
(۱۱) ذلکم الله ربکم فاعبدوه	یہ تمہارا تربیت کرنے والا اللہ ہے پس اس کی اطاعت کرو	یہاں سے نبی کے انذار کی تفصیل ہے کہ اس نے
(۱۲) افلا تذکرون	پھر کیوں نہیں نصیحت مانتے	امت سے کیا کہا اور اس کا بیان آخری آیت تک چلا گیا ہے۔
(۱۳) الیه مرجعکم	اسی کی طرف تم کو لوٹ کر آنا ہے	
(۱۴) وعد الله حقا	اللہ کا وعدہ حق ہے	
(۱۵) انه یبدی الخلق ثم یعیده لیجزی الذین امنوا	وہ ہی مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر ان کو دوبارہ پیدا کرے گا کہ جزا دے ایمان لانے والوں	یہ بشارت کی تفصیل ہے جس کا ذکر (۵) میں ہوا۔

على كل شيء قدير

ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے
(یہ جملہ حالیہ ہے ---

(۵) الا انهم يثنون
صدورهم يستخفون
منه الا حين
يستغشون ثيابهم
يعلم ما يسرون وما
يعلنون انه عليم
بذات الصدور

کیا وہ (پیام اُن سنتا) از
سینے دوہرے نہیں کر رہے ہیں
کہ اس سے چھپیں) ۔ کیا وہ اپنے
کپڑوں کو لپیٹ لیتے ہیں تو وہ
(اللہ) نہیں جانتا کہ وہ کیا
چھپاتے ہیں ۔ اور کیا ظاہر کرتے
ہیں (سینے دوہرے کرنے سے مراد
جھک جاتا ہے تاکہ چہرہ سے جو آثار
خوف نمایاں ہیں ان کو چھپائیں)
بلکہ وہ تو سینوں میں جو راز ہیں
ان کو بھی خوب جانتا ہے
(نبی کی تبلیغ سے ان کو خوف پیدا
ہوا ہے جس کو وہ چھپانے کی
کوشش کرتے ہیں) یہاں
استدراک ہے۔

(۶) ومامن دابة في
الارض الا على رزقها
ويعلم مستقرها و
مستودعها. كل في
كتاب مبين

اور کوئی زمین پر چلنے والا نہیں ہے
مگر یہ کہ اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے
(استثنا) اور وہ جانتا ہے اس
کا جائے قرار اور اس کی پناہ کی
جگہ۔ یہ سب ایک کتاب میں ہے
(یعنی اس کے علم و قدرت کی وسعت

(۲) الّا تعبدوا الا الله انی لکم نذیر بشیر

(نذیر و بشیر رسول نے کہا کہ) کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرو میں تم کو ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں۔ اس کے اوپر وقال الرسول مقدر ہوگیا کیونکہ قول سے قائل کی شخصیت معین ہو رہی ہے۔

(۳) وان استغفروا ربکم ثم توبوا الیه یمتعکم متاعا حسنا الی اجل مسمی ویوت کل ذی فضل فضله وان تولوا فانی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر

اور یہ کہ تم استغفار کرو اپنے رب سے اور اس کی طرف رجوع کرو۔ تاکہ وہ دے تم کو ایک اچھی معیشت ایک زمانہ معین تک (حیات دنیا) اور دیا جائے ہر ذی فضل کو مرتبہ فضل (جس کا وہ مستحق ہوا) اور اگر تم نے روگردانی کی تو مجھے ڈر ہے۔ تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا (یہاں شرط و جزا کا صرف ہے)

شرح۔ پہلی جگہ فضل سے مراد تکمیل نفس ہے دوسری جگہ فضل سے مراد جزائے فضل ہے صنعت مشاکلت کا صرف ہے۔

(۴) الی الله مرجعکم وهو

اللہ ہی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا

میں تواے خطریہ نے اس کو توڑ توڑ کر مٹی پیدا کی۔ اور میدان بنائے پھر زمانے اس پر گذرے جنہیں کثیر نباتات و حیوانات کے جسم گلنے سڑنے سے زمین میں وہ مادے مل گئے جن سے وہ کاشت کے لائق ہوئی اور انسانوں کی بود و باش کے مناسب ہوئی۔ اور زمین کو انسانوں کی بود و باش کے لائق بنانے میں یہ اہتمام بلیغ ثابت کرتا ہے کہ وہ مقصود جس کے لئے ایسا ہوا نہایت اہم ہے پس انسان سے عمل احسن کرانا نہایت اہم امر ہے۔ اور ہے بھی ایسا ہی کیونکہ انسان کی صلاحیت اس کو ایسے مرتبہ فضل پر پہونچانے والے جس تک اور مخلوق خلاً جن و ملک کی رسائی نہیں۔ اس لئے غرض آفرینش یہی ہے کہ انسان اس اعلیٰ ترین کمال و قربت کو پہونچے۔ اور زمین کو انسان کی بود و باش کے لائق بنانے کا یہ اہتمام بلیغ اس کا شاہد ہے۔

پانچویں صنعت ذیل میں سورہ لقمان کے پہلے رکوع کی آیات ہیں۔ ان میں اول ایک امر بیان فرمایا ہے اُس کے بعد اس کی قصد کی تصریح۔ اس تقابل سے مراد کو معین کیا ہے۔ سورہ بقر کے پہلے رکوع میں بیان فرمایا ہے کہ اصول دین کا یقین جس کو حاصل ہے وہ ہی قرآن مجید سے ہدایت پا سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اصول دین آیات کی مراد کا قرینہ حالی ہیں جس کو ان اصول کا پورا یقین دلائل قطعیہ سے حاصل ہو چکا وہ ان اصول کے خلاف تعبیر کی طرف نہ جائیگا اور صحیح مراد تک پہونچے گا۔ وہ آیات یہ ہیں

ذالك الكتاب لاريب فيه هدى للمتقين الذين يؤمنون بالغيب ويقيمون الصلوٰة ومما رزقناهم ينفقون	اس کتاب کے بارہ میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہدایت ہے ان محتاط لوگوں کیلئے جو ایمان رکھتے ہیں ذات غائب (اللہ) پر اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو روزی کا ہم نے

(۷) وھو الذی خلق السموات والارض فی ستۃ ایام و کان عرشہ علی الماء لیبلوکم ایکم احسن عملا

ایسی ہے کہ جانور کو اس کا رزق پہونچانا اسی کا کام ہے۔ اور وہ ان کے ٹھہرنے اور چھپنے کی جگہ سے آگاہ ہے اور وہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمان اور زمین کو چھ زمانوں میں درحالیکہ اس کی حکومت تھی پانی پر تاکہ تم کو ابتلا میں ڈالے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے۔

اس آیت میں توریت حصہ تکوین رکوع اول کا اقتباس ہے وہاں بیان ہوا ہے کہ ابتداءً زمین پانی (کی طرح رقیق) تھی اور (یہاں سائنس بھی اس بیان سے متفق ہے کہ شدت حرارت سے زمین رقیق تھی) توریت کا بیان ہے کہ کرہ ہوا بالکل تاریک تھا (کیونکہ شدت حرارت سے بہت سے اجزائے ارضیہ بخار بن کر اس میں ملے ہوئے تھے) وہ ٹھنڈے ہو کر جمے اور زمین پر بیٹھے تو کرہ ہوا صاف ہوا اب چاند و سورج پیدا (نمودار) ہوئے۔ پھر پانی جو بخار تھا جما اور زمین پر آیا۔ سمندر پیدا ہوئے پھر نباتات پیدا ہوئے۔ پھر پانی میں جاندار پیدا ہوئے۔ بعدہ پرندوں کا حدوث ہوا اس کے بعد زمین پر رینگنے والے مویشی اور درندے پیدا ہوئے آخر میں انسان کا ظہور ہوا۔ اور اس ارتقاء کے چھ ایام یا زمانے جدا جدا ہوئے۔ وکان عرشہ علی الماء کو توریت میں اس طرح بیان کیا ہے اور اللہ کی روح پانی پر حرکت کرتی تھی۔ دونوں جگہ مراد یہی ہے کہ زمین رقیق تھی اور خدا کا تصرف اس پر عامل تھا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس آیت میں فرمایا ہے کہ ہم نے زمین و آسمانوں کو چھ دن میں بنایا تاکہ انسان کا ابتلا کریں۔ تو ان جملوں میں ربط کیا ہے؟ اوپر ایک بحث میں کہ عالم ہمہ تن سامان تربیت ہے ہم نے بیان کیا ہے کہ رقیق کرہ زمین جب سرد ہو کر منجمد ہوا تو وہ ایک سخت پتھر تھی نہ نہائے دراتہ

(ایمان بالآخرت کو اللہ اور رسول پر ایمان لازم ہے)

(۵) اولئک علی ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون — وہی اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں

(۶) ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذھا ھزوا اولئک لھم عذاب مھین — اور لوگوں میں سے جو خرید کرتا ہے کھیل بنا نا قرآن کا (الحدیث قرآن کا نام ہے) تاکہ گمراہ کرے راہ خدا سے بغیر علم یقینی کے) اور اس کو (قرآن کو) دل لگی بنا لیا ہو ان کے لئے ذلت کا عذاب ہے

(۷) واذا تتلی علیہ ایاتنا ولی مستکبرا کان لم یسمعھا کان فی اذنیہ وقرا فبشرہ بعذاب الیم — اور جب اس کو ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ غرور کے ساتھ روگردانی کرتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں جیسے اس کے کانوں میں گرانی ہو تو خبر دے اس کو عذاب الیم کی۔

انہیں آیات ۵ سے ۵ تک کا بعینہ وہی مطلب ہے جو سورہ بقرکی مذکورہ بالا آیات کا ہے متقین کی بجائے محسنین آیا ہے۔ محسن نیکوکار ہے اور نیکوکار بالضرورت متقی ہوتا ہے لہذا وہی مراد ہوئی اور یہاں ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا ذکر نہیں ہے لیکن ایمان بالآخرۃ کا ذکر ہے اور ایمان بالآخرت اسی کو ہو سکتا ہے جو اللہ اور رسول کو مانتا ہو۔ لہذا ان آیات کی مراد

والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاخرۃ ھم یوقنون واولئک علی ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون	وہی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (خدا کی راہ میں) اور جو اس پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر نازل ہوا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔ اور وہی آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ وہ ہی اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہونیوالے (نجات پانے والے) ہیں

یہاں بتایا ہے کہ قرآن مجید صرف ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو محتاط ہوں (بیباک نہ ہوں) تعبیر آیات میں اور جن کو ایمان یا یقین اصول دین پر حاصل ہو۔ یعنی ایمان باللہ۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالاخرت اور وہ یقین اس درجہ پر ہو کر ان کی عمومی روشش دینداری کے مطابق ہو کہ نماز کے پابند ہوں اور خدا کی حب میں مال صرف کریں۔

توضیح۔ متقین کا مادہ وقا جس کے معنی ہیں تحفظ عن الخطر یعنی احتیاط اس سے لئے متقین یعنی محتاط ہوا یعنی جو بے پروا اور بیباک نہ ہو۔ اس تخصیص کی وجہ کہ کیوں انھیں کو قرآن ہدایت کرتا ہے اور کسی کو نہیں اوپر بیان کر آئے ہیں۔

سورہ لقمان۔ (۱) تلک ایات الکتاب الحکیم۔	یہ آیات ہیں محکم کتاب کی
(۲) ھدی ورحمۃ للمحسنین	جو عمل نیک کرنیوالوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے
(۳) الذین یقیمون الصلوۃ و یوتون الزکوۃ	جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں
(۴) وبالاخرۃ ھم یوقنون	اور آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں

٣- نزل عليك الكتاب بالحق
مصدقا لما بين يديه
وانزل التوراة والانجيل

۳- اس نے تجھ پر کتاب نازل کی بھی
کر یا ہے جو تصدیق کرنے والی ہے اپنے
سابق (کتابوں کی) اور نازل کیا اس نے
توریت و انجیل کو۔

٤- من قبل هدى للناس و
انزل الفرقان - ان الذين
كفروا بايات الله لهم
عذاب شديد والله عزيز
ذو انتقام

۴- سابق میں لوگوں کے لئے ہدایت
اور نازل کیا فرقان (شریعت) کو جو
رد کرتے ہیں اللہ کی آیات ان کو
سخت عذاب ہے۔ درحالیکہ اللہ
قادر اور سزا دینے والا ہے۔

٥- ان الله لا يخفى عليه شئ
فى الارض ولا فى السماء

۵- اس سے چھپی کوئی چیز نہیں زمین
و آسمان میں

٦- هو الذى يصوركم فى
الارحام كيف يشاء -
لا اله الا هو العزيز الحكيم

۶- وہی صورت دیتا ہے تم کو ماں
کے پیٹوں میں جیسی چاہتا ہے کوئی
معبود نہیں سوائے اس عزیز حکیم کے

٧- هو الذى انزل عليك الكتاب
بالحق منه ايات محكمات
هن ام الكتاب واخر
متشابهات فاما الذين
فى قلوبهم زيغ فيتبعون
ما تشابه منه ابتغاء
الفتنة وابتغاء تاويله
وما يعلم تاويله الا الله
والراسخون فى العلم

۷- وہی ہے جس نے اتاری حق سے تجھ
پر جیسی کہ چاہیے۔ اس میں مضبوط
آیات ہیں اور وہ ماخذ ہیں احکام
کی۔ اور دوسری (یا کچھ اور
آیات) ہیں متشابہ (آپس سے)، تو جن
لوگوں کے دل میں کجی ہے (گمراہی)
پس وہی در پے ہوتے ہیں اس کے
جو متشابہ ہے اس (کتاب) میں سے
چاہتے ہوئے فتنہ انگیزی اور چلتے ہوئے

وہی ہوئی جو سورہ بقر کی مذکورہ آیات کی۔ یعنی جن کو اصول دین کا یقین ہے وہی قرآن کی صحیح تعبیر کر سکتے ہیں اور اس سے ہدایت پا سکتے ہیں

آیت ۱۰ اور ۱۱ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو قرآن مجید کی تعبیر اس کے مخالف طریقہ پر کرتے ہیں۔ اس طرح صحیح طریقہ تعبیر جو اوپر کی پانچ آیات میں بیان ہوئی اس کی توضیح کی گئی ہے۔ ان گمراہوں کے طریقہ تعبیر کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

۱۔ کہ وہ بغیر علم یقینی تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ اور قرآن کا کھیل بناتے ہیں یعنی جو جی میں آیا بلا تامل آیت کے معنی قرار دے لیے۔ بیباک ہیں۔

۳۔ اور ان کے بیان کی غرض لوگوں کو دھوکا دینا ہے کہ وہ بڑے عالم ہیں۔ اور اس طرح وہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

۴۔ اور اگر ان کو آیات صحیح مراد کے ساتھ سنائی جائیں تو وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں اور بڑے تکبر سے کہ گویا وہی عالم قرآن ہیں صحیح مراد کو رد کر دیتے ہیں۔ اور یہ رد عدم التفات کے ساتھ ہوتا ہے۔

پس تفسیر کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ غور و فکر کے ساتھ قرائن مراد کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیت کی مراد قطعی یقین کے ساتھ حاصل کرنا چاہیے۔

جامع و مانع بنانیکی چھٹی صنعت

ایک مسلسل کلام میں ذو معنی لفظ کو پے در پے جملوں میں اس طرح صرف کر سکتے ہیں کہ لفظ کی صحیح مراد عیاں ہو جائے۔ آل عمران کے پہلے رکوع میں اسی صنعت سے کلام کو جامع و مانع بنایا ہے۔

۱۔ الم

۲۔ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم

۱۔ الم

۲۔ سوائے اس حی اور موجود بالذات کے کوئی معبود نہیں ہے۔

ان پانچوں جملوں سے کتاب یعنی قرآن کا مفہوم پورے طور پر معین ہے۔
خیال ۲: 'آیات متشابہات' کا صرف چھ جملوں میں کیا۔ اس طرح ان کی مراد معین کی۔

اول۔ قرآن میں دو طرح کی آیات ہیں ایک جامع و مانع و مبرہن۔ دوسرے ان سے ظاہر یعنی ملتی جلتی آیات ہیں یعنی جو صرف حرفوں سے مرکب ہوتے ہیں محکمات سے متشابہ ہیں۔

دوم۔ متشابہات کی تعبیر سوائے اللہ اور راسخ علم حضرات کے کوئی نہیں جانتا اور ظاہر ہے کہ حروف مقطعات کی تعبیر کسی عقلی قاعدہ سے ممکن نہیں۔ اللہ کی طرف سے جن کو تائید الہام ہے وہ اس کو جانتے ہیں

سوم۔ راسخون فی العلم جو ہدایت الٰہی سے سرفراز ہیں۔ وہ کہتے ہیں (یعنی امت کی تعلیم کے لئے) ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ قرآن کا جز ہیں جو من اللہ ہے بس اور اس کے معنی نہیں بیان کرتے۔

چہارم۔ جن کے دلوں میں کجی ہے (ضلالت) وہ متشابہات کے درپے ہوتے ہیں کہ فتنہ انگیزی کریں اور ان کی تعبیر کریں (جو عوام اضال ہیں)

پنجم۔ راسخ العلم اس کجی دل سے پناہ مانگتے ہیں کہ وہ منافی ہدایت ہے۔

ششم۔ راسخون فی العلم نے متشابہات کی وضع دیکھکر بحکم عقل یہ سمجھا کہ ان کی مراد عوام امت سے مخفی رکھنا منظور ہے۔ اس لئے امت کو ہدایت کی کہ وہ متشابہات کو منزل من اللہ مانیں اور قرآن کا جز جانیں۔

ان چھ جملوں سے عیاں ہے کہ متشابہات یعنی حروف مقطعات ہے اسی طرح راسخون فی العلم اور زیغ کو جملوں میں بار بار صرف کرکے ان کی مراد معین کی ہے۔
متشابہات اور مقطعات کی مفصل بحث اس جلد کے آخر میں ہے۔

يقولون امنا به كل من عند ربنا وما يذكر الا اولو الالباب

اس کی تعبیر کرنا حالانکہ اس کی تعبیر سوائے اللہ و راسخون فی العلم کے کوئی نہیں جانتا (راسخ العلم کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس پر سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ حال یہ ہے کہ سوائے عقل سے کام لینے والوں کے کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا۔

۸۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب

۸۔ (راسخ العلم کہتے ہیں) اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو بعد اس کے کہ تو نے ہم کو ہدایت دی ہے کج کر اور عطا کر ہم کو اپنی رحمت بیشک تو ہی عطا کرنے والا ہے۔

۹۔ ربنا انك جامع الناس ليوم لا ريب فيه ان الله لا يخلف الميعاد

۹۔ اے ہمارے رب بیشک تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو۔ بے تحقیق اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

مثال ۱۔ لفظ "الکتاب" کی مراد بیان کرنے کو آسے اتنے جملوں میں صرف کیا
الکتاب بمعنی صحیفہ۔ بمعنی قرآن اور بمعنی احکام ہے
اول۔ اللہ نے تجھ پر کتاب اتاری جیسی کہ چاہیے
دوم۔ وہ اپنے سے سابق کتابوں کی مصدق ہے
سوم۔ ان سابق کتابوں میں توریت و انجیل ہیں جو ہدایت ہیں مثل اس کے
چہارم۔ یہ کتاب فرقان یا شریعت کے علاوہ ہے جو الہامی ہے۔
پنجم۔ اللہ نے جو کتاب اتاری اس میں مضبوط آیات ماخذ احکام ہیں اور اس میں متشابہات یعنی حروف مقطعات ہیں۔

۵۸۔ ذلک نتلوہ من الآیات والذکر الحکیم	یہ نشانیاں اور محسوسہ قرآن ہم پڑھ کر سناتے ہیں۔
۵۹۔ ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون	بتحقیق اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال ایسی ہے جیسے آدم کی مثال کہ اس نے بنایا اس کو مٹی سے اور کہا کہ ہوجا اور وہ ہوگیا۔

حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کے وقت علمائے یہود میں احکام الٰہی کی پابندی نہ تھی اور نہ وہ ریاکار تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے مواعظ میں ان کو علی الاعلان ملامت کرنا اختیار کیا۔ متی باب ۲۳۔ ۱۴۔ وائے ہو تم پر اے فقیہو اور اے فریسیو مکارو کہ تم بیواؤں کے گھر کھا جاتے ہو اور دکھانے کو اپنی نمازوں میں طول دیتے ہو۔ اس طرح کے آپ کے متعدد جملے انجیل میں ہیں۔ علمائے یہود نے خوف محسوس کیا کہ لوگ ان سے پھر جائیں گے۔ اس لئے حضرت عیسیٰ کو ایک جھوٹا الزام لگا کر ان کے قتل کا حکم حاکم سے لے لیا۔ حضرت عیسیٰؑ اس زمانہ میں بیت المقدس آئے ہوئے تھے ان کو اس کی خبر ملی۔ کوئی مفر نظر نہ آیا۔ آپ نے یہ دعا کی جو تینوں انجیلوں میں موجود ہے۔ متی باب ۲۶۔ ۳۹۔ لوقا باب ۲۲۔ ۴۲۔ مرقس باب ۱۴۔ ۳۶۔ اور وہ تھوڑا آگے گیا اور سجدہ میں گرا اور کہا اے باپ اگر مناسب ہو تو یہ پیالہ مجھ سے دفع ہو جائے۔ بہرحال تیری رضا پوری ہو نہ کہ میری۔ اس دعا کی اجابت میں یہ وحی ہوئی یٰعیسیٰ انی متوفیک الخ اے عیسیٰ (خوف مت کر جیسا ہے) میں خود تجھکو وفات دینے والا ہوں اس لئے تم کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور یہ سبب ہوگا منکرین سے تمہاری نجات کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرب قیامت میں تم اپنی سرداری میں مسلمانوں کو لے کر جہاد کرو گے اور تمہارے یہ مسلمان تابعین کفار پر غلبہ پائیں گے اور وہ غلبہ قیامت تک رہیگا یہ کفار تمہارے ہاتھ سے دنیا میں بھی شدید عذاب کے ساتھ ہلاک ہوں گے اور

جامع ومانع بنانےکی ساتویں صنعت

جملوں کو علاقہ سبب ومسبب سے پے در پے مربوط کر کے مراد کا معین کرنا۔ اس صنعت کا صرف ال عمران - ۷۰ میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ آیت کا ایک لفظ دو معنی کا محتمل تھا۔ اس کے مصداق کی مثال بعد کی آیت میں لاکر اس کی مراد کو معین کیا ہے۔

ال عمران - ۷۰

(۵۵) اذ قال الله یعیسی انی متوفیك ورافعك الی ومطهرك من الذین کفروا وجاعل الذین اتبعوك فوق الذین کفروا الی یوم القیامة ثم الی مرجعکم فاحکم بینکم فیما کنتم تختلفون۔

جب اللہ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں خود تجھکو وفات دینے والا ہوں (یعنی مرض الموت سے وفات ہوگی) اور (اس لئے) میں تجھکو اٹھا لینے والا ہوں اپنی طرف اور (اس طرح) نجات دینے والا ہوں منکروں سے (تیری نبوت کے) اور (عہدہ) بنانیوالا ہوں تیرے تابعین کو غالب کافروں پر قیامت کے دن تک پھر تم لوٹ کے آؤ گے میری طرف تو میں فیصلہ کرونگا تمہارے درمیان آئیں جسمیں تم اختلاف کرتے تھے

(۵۶) فاما الذین کفروا فاعذبهم عذابا شدیدا فی الدنیا والاخرة ومالهم من ناصرین

تو منکروں کو میں عذاب شدید کرونگا دنیا اور آخرت میں۔ اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

(۵۷) واما الذین امنوا وعملوا الصالحات فیوفیهم اجورهم والله لا یحب الظالمین

اور جو مومنین صالحین ہیں ان کو ان کا اجر پورا کیا جائیگا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا

آخرت میں بھی فی النار ہوں گے۔ مومنین مظفر و منصور ہوں گے۔ یہ بھی ان کے ایمان و عمل کی جزا میں ہوگا

ذالك نتلوه من الايات والذكر الحكيم میں لفظ آیات کے دو معنی بظاہر ہو سکتے ہیں۔ آیات قرآن۔ اور حکمت و قدرت الہی کی نشانیاں لہذا بعد ہی کی آیت میں آدمؑ و عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر وارد ہوا تاکہ آیات سے نشان قدرت و حکمت مراد ہونا معلوم ہو جائے۔ ویسے بھی آیات اور قرآن کا عطف بتارہا ہے کہ قرآن اور ہے اور آیات اور۔ یعنی وہ قرآن کا جز نہیں۔ کیونکہ کل و جز معطوف نہیں ہو سکتے۔ جیسے یہ کہنا کہ ہند و بنگال زرخیز ہیں درست نہیں۔

آٹھویں صنعت ابتدائے کلام میں غرض بیان ظاہر کر دینا جس سے سوق کلام معین ہو جائے۔ اس اشارہ کے بعد آیات کی مراد لامحالہ اس طرح معین کرنا ہوگی کہ وہ اسی غرض کی طرف راجع ہوں۔ ذیل کی آیات میں ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کا جہاد سے جان چرانا مذکور ہے کہ کس کس طرح انہوں نے عذر کئے اور منافقوں سے موافقت کی۔

قتال۔ رکوع۔ ۳

۱۔ ويقول الذين امنوا لولا نزلت سورة	اور ایمان لانے والوں نے کہا کہ کیوں نہ اتری کوئی سورۃ (جہاد پر۔ اگر اترتی تو ہم جہاد کرتے)
۲۔ فاذا انزلت سورة محكمة وذكر فيها القتال رايت الذين فى قلوبهم مرض ينظرون اليك نظر المغشى عليه من الموت	پھر جب ایک محکم سورہ اتارا گیا اور اس میں جہاد کا ذکر ہوا۔ تو دیکھا تو نے ان لوگوں کو جنکے دل میں مرض (نفاق) ہے وہ دیکھتے ہوئے تیری طرف ایسی نظر جو موت سے غشی ہونیوالے کی ہو۔

فی بعض الامر واللہ یعلم اسرارھم

کا آنا را ہوا ناگوار ہوا تھا کہ ہم تمہاری اطاعت کریں گے بعض امور میں (یعنی منافقوں سے) درحالیکہ اللہ ان کے رازوں سے آگاہ ہے۔

منافق تو جہاد کے مخالف تھے ہی کہ حکم جہاد پر آیات سنیں تو ان پر اس قدر شاق گذریں کی مردنی ان کی آنکھوں سے ظاہر ہوئی لیکن بعض مسلمان بھی جہاد سے گریزاں تھے۔ پہلے تو انھوں نے یہ عذر کیا کہ قرآن مجید میں حکم جہاد آئے تو ہم جہاد میں شریک ہوں اور جب حکم آیا تو اس میں تاویل علیل کی کہ جہاد سے جان بچائیں جس پر افلا یتدبرون القرآن الخ سے زجر وارد ہوا۔ یہ آیت اس آیت سے جس کا ذکر پانچویں صنعت میں ہوا یعنی افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ الخ کے ساتھ۔ الفاظ اور معنی میں ایک حد تک مشترک ہے۔ یعنی اس کا اقتصاص کرلیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں بدیع معجز کا صرف ہے تو اس سے سابق آیت میں بھی بدیع معجز کا صرف ہے۔

فھل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض

تو کیا قریب ہے کہ تم روگردانی کرو (آیہ قتال سے) یا (اسلام سے) اور (فساد فی الدین کرو) یا (جماعت میں افتراق سے فساد کرو)

وتقطعوا ارحامکم

(اور کاٹ لو اپنے رشتوں کو دین سے) یا اپنے برادران اسلام سے)

ان دو جملوں کے دو دو معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جو معنی اختیار کرو اس کو دوسرے معنی لازم آتے ہیں۔ اس طرح:۔

۱۔ آیہ قتال کے انکار کو ارتداد از اسلام لازم ہے اور ارتداد از اسلام کو آیہ قتال کا انکار۔

آیات سے ظاہر ہوا۔ اسی طرح یہاں بھی غلط معنی لئے ہیں جن آیات میں متشابہ اور محکم کا ذکر ہے وہ یہ ہیں :-

٧. هو الذی انزل علیک الکتاب منه ایات محکمات هن ام الکتاب واخر متشابهات فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاویله وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم. یقولون امنا به کل من عند ربنا	وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعض آیات ہیں وہ محکم ہیں اور متشابہ یا مشتبہ ہیں ان سے تو جن کے دلوں میں کجی ہے تو وہ پیروی کرتے ہیں اس میں سے (اس کے جز صرف) متشابہ حصہ (محکمات سے) تاکہ فتنہ انگیزی کریں اور تاکہ ان کی تعبیر کریں، حالانکہ ان کی تعبیر سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے کوئی نہیں جانتا۔ وہ (راسخ العلم) کہتے ہیں ہم ایمان لاتے ہیں (متشابہ) پر یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔
٨- وما یذکر الا اولوا الالباب	اور صرف وہ لوگ نصیحت مانتے ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔
٩- ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هدیتنا	(وہ کہتے ہیں) اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو کج نہ کر بعد اس کے کہ ہم کو تو نے ہدایت کی۔

صورت حال یہ ہے کہ یہ لوگ کلام اللہ کو پہلے سے مبہم مانتے تھے کیونکہ غلط عقائد کی وجہ سے اس کی صحیح مراد سمجھ میں نہ آتی تھی جب انھوں نے یہ آیات دیکھیں تو بے تحاشا متشابہ بمعنی مبہم اور اس کے مقابل محکم کو معنی صاف صاف

۲۔ اس میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ جامع ومانع ومدلل بھی ہے۔

۳۔ بیانات کو جامع ومانع بھی رکھا ہے۔

۴۔ اس میں ایک خاص صنعت کا ہرف بھی ہے جو جامع ومانع بناتی ہے۔

۵۔ اور ایسے تمام صنائع کا احصار بھی ہے۔

۶۔ اس میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ مدلل بھی ہے۔

۷۔ اس رکوع کو مدلل بھی رکھا ہے۔

۸۔ اس میں ایک خاص نوع ثبوت کا ہرف بھی ہے۔

۹۔ اور تمام انواع ثبوت کا احصار بھی کیا ہے۔

پس اس کلام کا ہرف عالم مطلق سے صادر ہونا عیاں ہے اس کے سوا کسی اور کی طاقت سے باہر ہے جس طرح اوپر ان رکوعوں سے بحث کی گئی ہے اسی طرح آگے ایک باب میں ان میں سے ہر رکوع اور اس کے طریقہ استدلال سے بحث ہے اور ہر نوعِ دلیل کی تفصیل و توضیح ہے اور ثابت کیا ہے کہ ثبوت کی تمام ممکن انواع کا احصار قرآن مجید نے کیا ہے۔

آیات متشابہات

قرآن مجید کا جامع ومانع ہونا ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں اور آگے اس کا مزید ثبوت بھی آئے گا۔ یہاں مخالف یہ کہہ سکتا ہے کہ خود قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ اس کی کچھ آیات متشابہ ہیں۔ اور متشابہ بمعنی مبہم یا ناقص الدلالت ہے لہٰذا بعض آیات کا جامع ومانع نہ ہونا ثابت ہوا۔

جواب۔ متشابہ کے معنی ہیں مانند یکدگر۔ اور بعض علماء نے متشابہ کے معنی اپنی ایجاد طبع سے زبردستی مبہم یا گول گول بات قرار دے لئے حالانکہ یہ لفظ نہ لغت میں اس معنی سے ہے اور نہ محاورہ عرب سے اس کی سند لا سکے ہیں پس چونکہ ان لوگوں نے بعض آیت کے معنی مبہم کئے ہیں جیسا کہ ہم ابھی اوپر کی تفسیر

دیکھئے ان تمام آیات میں دو چیزیں ہیں کہ ایک کو دوسرے کا متشابہ فرمایا ہے۔
سوم۔ تیسرا قرینہ یہ کہ محکمات کو ماخذ احکام فرمایا ہے۔ اس میں ان کی تخصیص کی ہے پس متشابہات ماخذ احکام نہیں ہیں۔ اور یہ بات حروف مقطعات ہی کے لئے ہے کیونکہ بعض سے دوسرے سے معلوم نہیں اس کے سوا کوئی دوسری آیت نہیں جس کی تعبیر قطعی نہ ہو سکے یا جو ماخذ احکام نہ ہو۔ یہ کہ ہر آیت یا تو بالتصریح حکم دیتی ہے یا کسی امر حق کا بیان ہے جس کے یقین کرنے کا علم اس کے کلام الٰہی ہونے سے حاصل ہے۔

چہارم۔ متشابہات کے متعلق فرمایا کہ ان کی تعبیر سوائے اللہ اور راسخون فی العلم کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور ظاہر ہے کہ حروف مقطعات ہی کے معنی کسی قاعدہ عقلی سے حاصل نہیں ورنہ اور آیات کی تفسیر تو سب مفسرین نے کی ہے۔ لہٰذا متشابہات انہیں حروف مقطعات کو فرمایا ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں راسخون فی العلم نے متشابہات کی تعبیر بتائی ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ راسخ العلم ان کی تعبیر سے سکوت کرتے ہیں۔ امت کو یہی ہدایت کرتے ہیں ان پر ایمان لاؤ اور قرآن کا جزو مانو۔

پنجم یہ کہ ان متشابہات کی تعبیر وہی کرتے ہیں جن کے دل میں کجی ہے ان کی تعبیر کرنا حرام ہے۔ لہٰذا وہ حروف مقطعات ہی ہو سکتے ہیں۔

ششم۔ یہ کہ یہ گمراہ لوگ ان کے ذریعہ سے فتنہ انگیزی کرتے ہیں۔

۱۔ چنانچہ یہود نے فتنہ انگیزی ان کے ذریعہ سے کی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

۲۔ فرقہ باطنیہ کا فتنہ برپا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ حروف مقطعات کی مراد سوائے امام کے کسی کو معلوم نہیں۔ لہٰذا شریعت کی باطنی تعلیم اور ہے۔ اور ظاہری اور شریعت کے ظاہری احکام سب باطل ہیں قرآن میں حرام و حلال کا بیان غلط۔ ہر فعل جائز ہے بلکہ مرتبہ اشتغال پر شیخ سے شنیع افعال کرنا ضروری ہیں۔

۳۔ زمانہ حال میں قادیانیوں نے حمعسق سے مرزا غلام احمد کی نبوت پر استدلال کیا۔ کہا کہ حمعسق سے مراد حسین فی القادیان ہے۔

لے لیا۔ ان کے نزدیک قرآن الفاظ کو محاذ اللہ غلط سلط معنی سے لوتا ہے پس جو معنی چاہا ہو لگا لو۔ حالانکہ محکم یعنی صاف صاف اور متشابہ یعنی مبہم یا گول گول نہ کسی لغت میں ہیں نہ محاورہ عرب میں۔ حقیقت یہ ہے کہ متشابہات سے مراد صرف حروف مقطعات ہیں اور قرآن کی وہ کل آیات جو پڑھی جاتی ہیں اور اس لئے لفظ قرآن کا مصداق ہیں سب محکم ہیں۔ حروف مقطعات کو متشابہ اس لئے کہا ہے کہ وہ حرفوں سے مرکب ہونے میں محکمات سے مشابہہ ہیں ورنہ نوعیت میں ان سے مختلف ہیں۔ لفظ متشابہ باب تفاعل سے ہے اس کے ساتھ دوسری شے کا ذکر لازم ہے۔ یہاں متشابہ اور محکم کا ذکر ہے اس لئے وہ محکمات ہی کا متشابہ رکھی ہیں۔ اس معنی کے متعدد قرینہ ان آیات میں فراہم کر دئے ہیں اور دیگر آیات سے بھی حاصل ہیں۔ اول۔ اس معنی کی طرف آیت میں دوسری جگہ اُن کو ماتشابہ کہکر اشارہ کیا ہے۔ اور اس کا ترجمہ سبنے کیا ہے جو مشابہ ہے۔
دوم۔ بہت سی آیات میں متشابہ آیا ہے اور وہاں اس کا معنی مشابہہ ہونا تمام علماء کو مسلم ہے۔

بقر۔

ھٰذا الذی رزقنا من قبل واتوا بہ متشابھا	یہ وہ ہے (میوہ) جو ہم کو پہلے روزی ہوا حالانکہ ان کو (صرف) اس سے مشابہہ (میوہ) دیا گیا تھا۔
انعام۔ والزرع مختلفا اکلہ والزیتون والرمان متشابھا وغیر متشابہ	اور کھیتی جس کے پھل مختلف ہیں اور زیتون اور انار مانند یکدگر اور مختلف صورتوں کے۔
کذالک قال الذین من قبلھم مثل قولھم۔ تشابھت قلوبھم۔	ایسے ہی کہا ان سے پہلے لوگوں نے مثل ان کے قول کے۔ ان کے دل مانند یکدگر ہیں۔

دلیل ہشتم۔ قرآن مجید کا ضابطہ ہے کہ جب وہ آیات یا الفاظ و حروف بیان
کرتا ہے تو اس کی مثالیں ہر سورہ میں موجود کر دیتا ہے۔ یہاں آیات کا محکم اور متشابہ
بنا بیان فرمایا۔ لہٰذا اسی رکوع میں محکم اور متشابہ کی مثال موجود ہونا چاہیئے۔ اس
رکوع کی ابتداء کو غور سے دیکھئے۔

۱۔ الم
۲۔ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم
۳۔ نزل علیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ وانزل
التوراۃ والانجیل
۴۔ من قبل ھدی للناس وانزل الفرقان۔ ان الذین کفروا
بآیات اللہ لھم عذاب شدید واللہ عزیز ذوانتقام
۵۔ ان اللہ لا یخفی علیہ شئی فی الارض ولا فی السماء
۶۔ ھو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء۔ لا الہ الا
ھو العزیز الحکیم
۷۔ ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات
ھن ام الکتاب واخر متشابھات۔

اس آخری آیت سے اوپر جو قدر نازل ہوا ہے سوائے الم کے جو علیحدہ آیت ہے
سب یقینی جن کے معنی ہیں۔ ان کے معنی میں اہل اسلام میں اختلاف نہیں۔ لہٰذا وہ سب
محکمات ہیں، متشابہات نہیں۔ حروف الم باقی رہا جو متشابہ کی مثال ہے۔ اس طرح
ظاہر فرمایا کہ متشابہ سے مراد حروف مقطعات ہیں۔

دلیل نہم۔ علاوہ حروف مقطعات کے دیگر آیات قرآن کو متشابہ قرار
دینا اور متشابہ کی کوئی تعریف معین نہ کرنا امت میں فساد عظیم و افتراق شدید
کا سبب ہوا ہے۔ چنانچہ اتقان میں ہے کہ بعض علمائے اسلام نے اس قول کو اسی
طرح رد کیا ہے۔ قرآن مجید تا قیامت امت کے لئے ہدایت ہے یہ کیسے ممکن ہے

ہفتم۔ ان آیات کی تعبیر حرام ہونے کے متعلق فرمایا کہ اس حکم کو صرف وہ لوگ مانتے ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یعنی جب راسخون فی العلم نے قرآن منزل میں حروف مقطعات کو دیکھا کہ اُن کی تعبیر کسی قاعدہ عقل سے نہیں ہو سکتی تو انھوں نے بہ ہدایت عقل جان لیا کہ ان کی مراد عوام امت سے مخفی رکھنا منظور ہے۔ لہذا ان کے متعلق امت کی تکلیف صرف اس قدر ہے کہ وہ ان کو منزل من اللہ مانیں اور قرآن کا جز جانیں۔ چنانچہ بعینہٖ یہی ہدایت انہوں نے بصورت انہی سنت کے پیش کی۔

تفسیر برہان وعیاشی میں امام باقرؑ سے اور تفسیر اتقان میں دیگر طرق سے روایت ہے کہ بعض یہود آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ الم کے عدد ۷۱ ہیں لہذا آپ کی نبوت کا عہد ۷۱ سال ہے۔ آنحضرتؐ نے دیگر حروف مقطعات کو اس کے رد میں پیش کیا۔ جیسے المرا۔ المرا۔ اس واقعہ کے بیان کے بعد امام نے فرمایا کہ یہودیوں نے جو ان کی تعبیر کی وہ ان کی مراد سے الگ ہے۔ اور فرمایا کہ یہی (حروف مقطعات) وہ آیات ہیں جن کی طرف منہ آیات محکمات ہن ام الکتاب و اُخر متشابہات میں اشارہ ہے۔ اس حدیث سے بھی ثابت ہے کہ متشابہات صرف حروف مقطعات ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ امام کو ان کی مراد معلوم تھی کیونکہ آپ نے فرمایا اُن کی مراد اور ہے اور یہود کی تعبیر اور۔ اور امام نے ان کی تعبیر سے بھی سکوت فرمایا اور امام نے ان کو آیات قرآن فرما کر ان کو جزو قرآن اور منزل من اللہ ہونا بیان فرمایا۔ یہود کی اس فتنہ پردازی کا اثر مسلمانوں پر ہوا چنانچہ عبداللہ بن عباس نے ان کے قول سے متاثر ہو کر حروف مقطعات کی یہ تعبیر کی کہ وہ ہر قوم کے وجود کا زمانہ بتاتے ہیں۔ ان کے مختلف اقوال کا ذکر آگے آتا ہے۔ امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر جلد ا۔ الم کی بحث میں حضرت علیؑ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ کسی کے سوال کے جواب میں فرمایا۔ یہ وہ آیات ہیں جن کی تعبیر نہیں بتائی گئی۔

حکیم مطلق کی ذات سے ایسا کلام کرنا لازم آتا ہے جس کو کوئی مخاطب سمجھ نہیں سکتا۔ یہ
فعل عبث ہے اور حکیم مطلق سے منزہ ہے۔

دوسری دلیل مجاہد اور ضحاک نے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ راسخون فی العلم
ضرور متشابہات کی تاویل جانتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو قرآن کے ناسخ اور منسوخ کا
پتہ نہ چلے گا اور نہ اس کے حلال و حرام کا۔ (اس لئے کہ یہ احتمال قائم ہے کہ
متشابہات میں ناسخ احکام ہیں) علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ یہ اس بات پر دلیل
قاطع ہے کہ متشابہات کی تفسیر راسخون کو معلوم ہے۔ چنانچہ علامہ نووی نے اسی
قول کو اختیار کیا ہے اور اس پر ایک اور دلیل کا اضافہ کیا ہے "یہ بات بعید
ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے ایسا کلام کرے جسکو بندوں میں سے کوئی سمجھ نہ پائے"
تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کو ایک جملہ قرار دیا
جائے تو یہ قاعدہ نحوی سے غلط جملہ ہوگا۔ اس لئے کہ جملہ فعلیہ میں فعل فاعل
سے پہلے اور بصیغہ واحد ہوتا ہے۔ قرآن کی آیات دیکھئے

۱۔ اعراف۔ یقول الذین نسوہ قبل
۲۔ سبا۔ یقول الذین استضعفوا
۳۔ انعام۔ یقول الذین کفروا
۴۔ اسرائیل۔ اذ یقول الظالمون
۵۔ انفال۔ اذ یقول المنافقون
۶۔ قمر۔ یقول الکافرون ھذا یوم عسر
۷۔ حدید۔ یوم یقول المنافقون
۸۔ بقرہ۔ سیقول السفہاء من الناس
۹۔ الفتح۔ سیقول المخلفون

جب یہ کہنا منظور ہو کہ صرف فاعل ہی نے یہ کہا اور کسی نے نہیں تو فاعل کو
پہلے لاتے ہیں لیکن یہاں یہ مطلب ہے نہیں کہ راسخون فی العلم ہی یہ کہتے ہیں کہ ہم

کہ حکیم مطلق مبہم کلام ہدایت کے لئے بھیجے جس سے امت ضلالت میں مبتلا ہو۔ قدری کے نزدیک جو آیات محکم ہیں وہ جبری متشابہ بتاتا ہے جو جبری کے نزدیک محکم وہ قدری کے نزدیک متشابہ۔ یہی حال قائل رویت اور منکر رویت کا ہے وعلی ہذا۔ پس تم نے قرآن کو تماشہ بنا رکھا ہے اور قرآن پر اس کو حجت نہ رکھا۔ حالانکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اختلافات فرق کا رافع ہے۔

نحل وما انزلنا علیک الکتاب	اور ہم نے صرف اس لئے تجھ پر کتاب
الا لتبین لھم الذی	نازل کی کہ جس امر میں لوگ اختلاف
اختلفوا فیہ وھدی	کرتے ہیں وہ ان پر واضح و مبین ہو
ورحمۃ لقوم یومنون	ہو جائے۔

قرآن رافع اختلافات ہے تو حجت ہے اور حجت ہے تو مبہم نہیں لہذا اس کی آیات مبہم نہیں اور متشابہ بمعنی مبہم نہیں۔

دلیل دہم۔ قرآن مجید کو احسن الحدیث یا بہترین کلام فرمایا ہے تو مخلوق کے ہر کلام سے برتر ہے اور مخلوق کا ایسا کلام موجود ہے جو عیوب کلام سے پاک ہے۔ لہذا قرآن مجید بدرجہ اولیٰ عیوب سے پاک ہے اور مبہم اور ناقص الدلالت ہونا بدترین عیب کلام ہے۔ لہذا یہ اتہام ہے کہ قرآن مجید مبہم ہے۔

وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم کی بحث

اس آیت کے معنی تو ظاہر ہیں لیکن اپنی مستقل کجروی سے اکثر مفسرین نے یہ کہا کہ سوائے اللہ کے کوئی ان کی تعبیر نہیں جانتا۔ یہ آیت اس طرح دو جملوں میں منقسم ہے۔ وما یعلم تاویلہ الا اللہ۔ اور دوسرا جملہ ہے والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ ترجمہ۔ سوائے اللہ کے کوئی اس کی تعبیر نہیں جانتا اور راسخ العلم کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ قول باطل ہے۔ اول اس وجہ سے کہ اس صورت میں

متشابہات کی تعبیر کا حرام ہونا

فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ	ترجمہ: لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ ہی درپے ہوتے ہیں اس کے جو اس میں متشابہ ہے۔ چاہتے ہوئے فتنہ انگیزی اور چاہتے ہوئے اس کی تعبیر کرنا۔

۱۔ چونکہ وہی اس کی تعبیر کے درپے ہوتے ہیں جن کے دل میں کجی یا ضلالت ہے
۲۔ زیغ فی القلب سے مراد ضلالت ہونا آگے کی آیات سے آشکار کیا ہے

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ہدیتنا	اے ہمارے رب ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو کج نہ کر

یہاں زیغ کو منافی ہدایت قرار دیا ہے لہذا زیغ معنی ضلالت ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے باطل عقائد جو دل میں جاگزیں ہیں متشابہات کی تعبیر کے درپے ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ فتنہ جوئی کے لئے تعبیر کرتے ہیں وہ ہی فعل حرام کرتے ہیں۔ اس لئے کہ آیت نے دو جدا جدا فعلوں کو بالتصریح حرام کیا ہے ایک ابتغاء الفتنہ۔ فتنہ انگیزی کا ارادہ کرنا دوسرا ابتغاء تاویلہ۔ یعنی ان کی تعبیر کا ارادہ کرنا۔ متشابہات سے فتنہ انگیزی بغیر تعبیر کے بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے فرقہ باطنیہ نے کی ہے۔

۳۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کی تعبیر سوائے اللہ اور راسخ العلم کے کوئی نہیں جانتا۔ اور راسخون فی العلم ان کی تعبیر سے سکوت کرتے ہیں صرف اتنا کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے کہ وہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ باوجود مراد جاننے کے صرف اتنا کہنا مراد کے بیان سے سکوت کرتا ہے۔

اسی پر ایمان لائے۔ بلکہ یہ ان کی شان کو تعلیم ہے لہٰذا امت اس قول میں ان کے ساتھ شریک ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہی کہنا چاہئے۔

امام فخرالدین رازی نے ایک ضعیف دلیل اپنے قول کی تائید میں پیش کی ہے وہ یہ کہ اگر جملہ والراسخون فی العلم پر ختم ہوگا تو یقولون کی ضمیر اللہ اور راسخون فی العلم دونوں کی طرف راجع ہوگی یعنی اللہ اور راسخون فی العلم کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ لیکن ان کے لئے ایسا کہنا ممکن نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قاعدہ ہے ضمیر ایسے اسم کی طرف راجع ہونا چاہئے جو مذکور و قریب تر ہو اور وہ راسخون فی العلم ہے۔ علاوہ بریں یقولون جمع کا صیغہ ہے لہٰذا صرف اسم جمع الراسخون فی العلم کی طرف ضمیر جمع راجع ہو سکتی ہے نہ کہ اسم واحد اللہ کی طرف۔ اور اگر دونوں طرف راجع کرنا جائز بھی ہو تو یہاں اس کے خلاف کا قرینہ موجود ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس پر ایمان لائے۔

معنی ام الکتاب کی بحث

مفسرین نے ام الکتاب کے معنی کتاب کی جڑ بتائے ہیں جو یقیناً مہمل ہے۔ ام۔ ماں۔ ماخذ ہے اولاد کا۔ لہٰذا مجازاً ام بمعنی ماخذ ہوا اور کتاب بمعنی حکم اور احکام بمعنی جمع اور واحد دونوں ہے۔ چنانچہ ذیل کی آیات اس کے شاہد ہیں

۱۔ کتب علیکم الصیام	تم کو روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا
۲۔ رسول من اللہ یتلوا صحفا مطہرۃ فیہا کتب قیمۃ	رسول اللہ کا پڑھتا ہوا پاک صحیفے جن میں احکام حق ہیں
۳۔ ویعلمکم الکتاب والحکمۃ	تعلیم دیتا ہے تم کو احکام و معرفت کی۔

پس ظاہر ہے کہ ام الکتاب کے معنی ماخذ احکام ہیں۔

۷۔ محمد بن کعب القرظی اور ربیع بن انس کا قول ہے کہ یہ حروف صفات [illegible] کی طرف اشارہ ہیں۔

۸۔ ضحاک کا قول ہے کہ ان حروف سے اللہ اور [illegible] ان کے نام کی طرف اشارہ ہے۔ الم میں الف سے اللہ، لام سے جبرئیل، م سے محمد۔

۹۔ المبرد اور دیگر محققین کا قول ہے کہ جب کہا گیا کہ قرآن کی مثل لاؤ اور کوئی نہ لاسکا تو حروف مقطعات سے اشارہ ہوا کہ عبارت قرآن انہی حروف سے مرکب ہے پس تم عاجز ہوئے تو ثابت ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔

۱۰۔ عبدالعزیز بن یحییٰ کا قول ہے کہ جیسے تم نے پہلے حروف پڑھے پھر عبارت۔ اسی طرح اللہ نے پہلے حروف سنائے پھر کلام۔

۱۱۔ ابن روق اور قطرب کا قول ہے کہ کفار قرآن نہ سنتے تھے لہٰذا یہ عجیب حروف واقع ہوئے کہ توجہ کریں۔

۱۲۔ احمد بن یحییٰ کا قول ہے کہ کسی کلام کی ابتدا و ختم پر ایسے حروف لکھ دیتے تھے تاکہ ابتدا اور انتہا کا پتہ چلے۔

۱۳۔ قفال کا قول ہے کہ عرب حروف سے اشیا کا نام رکھتے تھے۔ جیسے لام الطائی کو لے۔ نحاس کو ص۔ نقد کو عین۔ سحاب کو غ۔ جبل کو قاف۔ حوت کو نون۔

۱۴۔ اخفش کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حروف کی قسم کھائی ہے۔

۱۵۔ ابوبکر تبریزی کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ لوگ قدم قرآن کے قائل ہوں گے لہٰذا حروف کو وارد کیا کہ حدوث قرآن ثابت ہو جائے۔

۱۶۔ قاضی الماوردی کا قول ہے کہ الم دراصل اَلَمْ بمعنی انزل ہے

۱۷۔ ابن جوزی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ان حروف سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ثنا کی ہے۔

آخر میں امام رازی کہتے ہیں کہ یہ بھی ممکن نہیں کہ ان سب کو معاً حروف

اب یہاں سے ثابت ہے کہ وہ کل مفسرین جنھوں نے متشابہات کی تفسیر بیان کی ہے۔ ضلالت میں مبتلا ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے عموماً متشابہات کی تفسیر بیان کی ہے اور اس حکم الہٰی کو پس پشت ڈال دیا۔ متشابہات کی تفسیر کرنے کو ضلالت لازم ہے۔ لہذا ایسے علمائے اسلام کا ضال ہونا اس آیت سے ثابت کیا ہے اور اس طرح ثابت فرمایا ہے کہ کوئی صورت ان کے خلاصی کی باقی نہیں رکھی اکثر کا اعتقاد ہے کہ سوائے اللہ کے ان کی تفسیر کوئی نہیں جانتا اس پر بھی تفسیر کی جرات کرنا دیدہ و دانستہ ضلالت اختیار کرنا ہے کیونکہ ان کی تفسیر ضرور غلط ہوگی۔ ان کا محض حیلہ ہے کہ یہ آیت متشابہ ہے۔ اس بہانہ سے جان بچاتے ہیں لیکن یہ راہ بھی یہاں مسدود کر دی ہے کیونکہ یہی وہ آیت ہے جو قرآن میں دو قسم کی آیات محکمات اور متشابہات کا ہونا بتاتی ہے۔ اگر اس کو متشابہ کہو تو پھر متشابہات کا وجود ہی قرآن میں ثابت نہ ہوگا۔ چنانچہ ان کی کج روی خود ان کے اقوال سے بھی عیاں ہے تفسیر کرنے میں وہ اضطراب و پریشان خیالی دکھائی ہے کہ العظمۃ للہ۔ امام فخرالدین رازی کہتے ہیں کہ حروف مقطعات کی تفسیر میں مفسرین کے سترہ اقوال ہیں۔

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ سوائے اللہ کے حروف مقطعات کی تفسیر کوئی نہیں جانتا ان کے نزدیک قرآن کی آیت یہی بتاتی ہے۔ یہ مانتے ہوئے اب ان کی جرات و جسارت دیکھیے۔

۲۔ خلیل و سیبویہ کا قول ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں۔

۳۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔

۴۔ کلبی۔ السدی اور قتادہ کا قول ہے کہ یہ قرآن کے نام ہیں۔

۵۔ ابن عباس کا قول ہے کہ یہ حروف اللہ کے ناموں کی طرف اشارہ ہیں۔

الف سے اللہ۔ ل سے لطیف۔ م سے منان

۶۔ ابوالعالیہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ہر قوم کی مدت کی طرف ان سے اشارہ ہے۔

ص الدلالت نہیں۔ لہذا متشابہ بمعنی مبہم، ناقص الدلالت نہیں۔
وم۔ متشابہ دو چیزوں کو چاہتا ہے کیونکہ اس کے معنی مانند یکدگر ہیں۔ ان دو
رف لفظ مثانی سے اشارہ کیا یعنی دہرائی ہوئی یعنی قرآن میں ہر بیان و حکم کو کم از
دو مرتبہ وارد کیا ہے۔ اس لئے کل کتاب کے دو جز ہوئے ایک اول بیان
را اس کی تصریف۔ ان دونوں کو متشابہ فرمایا ہے۔ عالم شریعت میں مثانی
راد کا ایک قرینہ موجود ہے توریت میں ایک کتاب استثنا یا مثانی ہے۔ دونوں
لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں باقی چار کتابوں میں جو احکام ہیں وہ اس آخری کتاب
ں دہرائے گئے ہیں۔ ظاہر ہوا کہ کتاب الہی میں احکام کو دو بار بیان کرنا ضروری ہے۔

راسخون فی العلم کی مراد

رسخ کے معنی ہیں آب بارش کا ریت کے اندر جانا اس لئے راسخ
یعنی گہرا جانے والا۔ اور راسخ فی العلم۔ جس کا علم عمیق ہو۔ ان آیات میں
راسخون فی العلم کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے وہ
لون ہیں۔

اول۔ حروف مقطعات کا علم اللہ اور ان کی ذات سے مخصوص ہے اور چونکہ
ان کی تعبیر کسی قاعدہ عقلی سے ممکن نہیں وہ علم اکتسابی نہیں۔ وہبی ہے۔ یعنی تائید
الہام سے حاصل ہوا۔ اس لئے وہ مورد الہام ہیں۔

دوم۔ چونکہ الہام معصوم ہی کو ہوتا ہے جیسا کہ ہم اوپر قرآن سے ثابت کر
چکے ہیں، لہذا وہ معصوم ہیں اس معنی سے کہ ان کا قول یا فعل عین صواب ہوتا ہے۔

سوم۔ چونکہ خداوند عالم نے ان کے علم کی مدح میں ان کو راسخ العلم فرمایا
لہذا امت میں اعلم اور دنیا سے واقف ہیں۔ لہذا امت کو علم دین میں ان کی
طرف احتیاج ہے۔

محاربہ اللہ کے اس قول کو یعنی آمنا بہ کل من عند ربنا کو مقام

مقطعات کے معنی قرار دیں۔ یہ اجماع کے خلاف ہے کیونکہ ہر مفسر نے اپنے ہی قول کو صحیح کہا ہے۔ متعدد اقوال کو صحیح نہیں مانا۔ ان تفاسیر سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے خیال میں جو بات آئی وہی تعبیر قرار دی۔ یعنی تفسیر بالرائے کی بلکہ تفسیر بالوہم۔ اور خدا کے حکم سے کہ متشابہات کی تفسیر حرام ہے نہ ڈرے اور ان کے اقوال کے اختلاف اور تضاد سے ان کا باطل ہونا ظاہر ہے۔ ابن عباس کے تین متضاد اقوال اوپر دئیے ہیں۔ جن سے ظاہر ہے کہ مختلف اوقات میں جس نے سوال کیا جو بات اس وقت خیال میں آئی ابن عباس نے بیان کر دی۔ اتقان میں حروف مقطعات کی تعبیر میں ان کے بے شمار متضاد اقوال مذکور ہیں۔ پس آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مفسرین کا طریقہ تفسیر کیا ہے۔ ایسے لوگ گم کردہ راہ ہیں چہ جائیکہ کہ راسخون فی العلم سے ہوں اور جب ان کا یہ حال ہے تو اور علمائے امت تو ان سے پست ہیں اور انہیں کے کاسہ لیس۔ وہ بدرجہ اولیٰ غلطی پر ثابت ہوئے۔

اگر کوئی کہے کہ متشابہ کے اس آیت میں کیا معنی ہیں۔ یہاں کل کتاب کو متشابہہ فرمایا ہے۔

الله نزل احسن الحديث	اللہ نے نازل کیا بہترین کلام (قرآن)
كتابا متشابه مثانی	کتاب متشابہہ دہرائی ہوئی۔

تو جواب یہ ہے کہ یہاں تو اور علماء نے بھی متشابہ کے معنی متشابہہ الاجزا ہی لئے ہیں۔ چنانچہ اتقان جلد ۲ صفحہ ۱ پر

ان المراد به تشابه كونه	ترجمہ۔ تشابہ کی مراد یہ ہے کہ اس کے
يشبه بعضه بعضا فی الحق	بعض اجزا بعض سے مشابہ ہیں حق
والصدق والاعجاز"	و صادق و اعجاز ہونے میں۔

دوم: اس آیت کی رو سے جب کل کتاب متشابہہ ہے تو وہ آیات جن کو تم محکمات مانتے ہو وہ بھی متشابہہ ہوئیں۔ لیکن وہ تمہارے نزدیک بھی مبہم یا

یعنی ان۔ وہ کہتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ باقتضاء عقل انہوں نے سمجھا کہ ان کی
مراد کلام امت سے مخفی رکھنا منظور ہے لہٰذا ان کی تعبیر کر انہوں نے سکوت
کیا۔ اور خلاف استنباط کیا کہ اس صورت میں امت کی تکلیف ان کے متعلق اس
قدر ہے کہ حروف مقطعات کو کلام اللہ اور منزل من اللہ مانیں۔ چنانچہ بعینہٖ اس
علم کو اپنے قول ہدایت سے ظاہر کیا۔ آمنا بہ کل من عند اللہ۔ یہاں سے
ظاہر ہے کہ جو ضروری حکم قرآن سے بغور و فکر حاصل ہے اس کو سہولت امت کے لئے
بیان کر دینا ان کا فریضہ ہے۔ یہ امر ہے کہ رسول اور راسخون فی العلم عقل اور
غور و فکر سے مطالب تک پہنچتے ہیں اور ان کا یہ استنباط عین صواب ہوتا ہے
ذیل کی آیت سے بخوبی واضح ہے۔

حجرات۔۱۔ یاایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین۔ واعلموا ان فیکم رسول اللہ۔ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم

اے ایمان لانے والو اگر ایک فاسق
تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس
کو بیان کرو (رسول سے) ایسا نہ ہو
کہ جہالت میں ایذا پہنچا دو کسی قوم
کو اور پھر نادم ہو اپنے فعل پر اور
جانو کہ رسول اللہ کا تمہارے
درمیان ہے۔ اگر وہ اکثر امور میں
تمہارا کہا مانے تو تم البتہ تکلیف
میں پڑو۔

وجہ استدلال۔ اگر کوئی فاسق یہ خبر لائے کہ فلاں قبیلہ برسرِ عناد ہے
اور مسلمان اس خبر پر اعتماد کرکے اس قبیلہ کو ایذا پہونچائیں بعدہ معلوم ہو کہ وہ
برسرِ فساد نہ تھے تو مسلمانوں کی طرف سے زیادتی ہوگی جس پر ان کو نادم ہونا پڑیگا
اس لئے ضروری ہے کہ اس خبر کو پہلے رسولؐ سے بیان کریں تاکہ وہ اس کی صحت
اور عدم اعتماد پر غور و فکر سے رائے قائم کرے۔ اس کی رائے صواب ہوتی ہے۔
لہٰذا اگر رسول سے اپنے اکثر امور میں رجوع کروگے اور اس کی رائے پر چلوگے

مدح میں خداوند عالم نے ذکر فرما کر پسند فرمایا۔ اور یہ بات انہوں نے امت سے کہی کہ اس کو ہدایت ہو۔ اس طرح ان کے ہادی امت ہونے کا اثبات کیا۔ ان کا امت سے خطاب کرنا اس طرح ثابت ہے کہ یہ کلام خدا سے نہیں ہے اگر خدا سے ہوتا تو کہتے امنا به کل من عندك یا ربنا۔ ترجمہ ہم ایمان لائے اس پر یہ سب تیری طرف سے ہے اے ہمارے رب۔ جب خدا سے خطاب نہیں تو لامحالہ امت سے خطاب ہے۔

پنجم۔ پس انہوں نے امت کو جو ہدایت کی اس کو خداوند عالم نے پسند فرمایا۔ لہذا امت پر واجب ہوا کہ ان سے ہدایت حاصل کرے۔ یہ بات اس طرح بھی عیاں ہے کہ ایک طرف راسخون فی العلم ہیں دوسری طرف عوام امت اور راسخون فی العلم میں رسول اللہ اور علیؑ داخل ہیں لہذا امت پر ان راسخون سے ہدایت حاصل کرنا واجب ہے۔

ششم۔ چونکہ جو حکم امت کی طرف راجع ہوتا ہے یعنی یہ کہ وہ حروف مقطعات کو کلام الہی اور قرآن کا جز مانیں۔ اس حکم کو خداوند عالم نے ان کی سنت (قول) کی صورت میں پیش کیا لہذا وہ اللہ کی طرف سے مامور ہیں کہ امت کو ہدایت کریں جس طرح کہ نبیؐ مامور بہ ہدایت ہیں (گو وحی نبی کی ذات سے مخصوص ہے) یہ سب اوصاف اس امت میں اگر کسی کے لئے ثابت ہو سکتے ہیں تو وہ ائمہ اثنا عشر ہیں۔ ان کا علم و تقوی و تقدس فریقین کو مسلم ہے۔ صرف انھیں کے لئے دعوی عصمت کیا گیا ہے۔ باقی اصحاب اور امت کا معصوم نہ ہونا شیعہ اور سنی سب کو مسلم ہے۔

راسخون فی العلم کے فرائض

اوپر بیان ہوا کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہی راسخون فی العلم ایسا اور ایسا حروف مقطعات کے متعلق کہتے ہیں۔ اس لئے کہ آیت ان کے کلام کو لئے ہوئے نازل ہوئی جس کا اس کے نزول سے پہلے واقع ہونا ضروری ہے۔

نہیں ہے۔ لہذا حروف مقطعات قوت اعجاز کے حصول میں معین ہیں۔ اس کا ثبوت یہ آیت ہے۔

نمل۔ قال الذی عندہ علم	کہا اس نے جس کے پاس ایک علم
من الکتاب انا آتیک	تھا کتاب میں سے کہ میں لاتا ہوں
بہ قبل ان یرتد الیک	اس کو قبل اس کے کہ آپ کی پلک
طرفک فلما رآہ مستقرا	جھپکے۔ پھر دیکھا اس کو رکھا ہوا
عندہ	اپنے پاس۔

یہ بیان ہے حضرت سلیمان کے تخت بلقیس منگوانے کا اور وہ شخص جس نے اپنے اعجاز سے اس کو ایک آن میں یمن سے بیت المقدس منتقل کر دیا حضرت آصف ہیں۔ اور آیت یہ کہتی ہے کہ آصف کو کتاب سے ایک علم حاصل تھا جس کی بدولت یہ قوت اعجاز تھی۔ کتاب سے مراد توریت ہے کہ وہی اس زمانہ میں کتاب دین تھی۔ جیسا یہ ومن قبلہ کتاب موسی اماما ورحمۃ دال ہے یعنی قرآن سے قبل کتاب موسیٰ رہبر اور رحمت تھی۔ پس ثابت ہوا کہ آصف کو یہ علم توریت سے حاصل ہوا۔ اور توریت کی آیات بہ ظاہر ایسی تعلیم سے اسی طرح خالی ہیں جیسے قرآن کی محکمات۔ لیکن اصل توریت عبرانی میں حروف مقطعات موجود ہیں اور سوائے اس کے اور کسی اور قدیم صحیفہ میں نہیں ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ قوت اعجاز کے حصول میں حروف مقطعات کو دخل ہے معصوم کے لئے قوت اعجاز ضروری ہے لیکن وہ اس سے اسی محل پر کام لے سکتا ہے جہاں اذن باری ہو۔ ورنہ وہ اس قوت سے کام لینے پر ماذون نہیں اس طرح معصوم کے ابتلا کو سخت تر کر دیا ہے کہ باوجود قوت دفع حاصل ہونے کے مصائب و آلام کا تحمل کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ سخت امتحان عوام امت کے مناسب حال نہیں یہ وجہ ہے کہ حروف مقطعات کی مراد کو عوام امت سے مخفی رکھنا ضروری ہوا۔ اور معصوم کو ان کا علم دینا ضروری ہوا اب رہا یہ سوال کہ آیا حروف مقطعات کے مدلول خود وہ علم ہیں جن سے قوت اعجاز

تو بہت سی پریشانیوں اور مصائب سے بچے رہو گے - یہ خبر ایک دنیوی امر سے
متعلق ہے جس میں خبر دینے والے کا اعتبار - اس قبیلہ کی سابق روش - اس کے
متعلق حال کی معتبر خبریں - سب پر اعتنا کرنے سے صحیح صورت حال کا اندازہ ہو سکتا
ہے - اور اس شخص کی خبر پر جو عادل نہیں ہے اعتبار درست نہ ہوگا - یہ سب
باتیں عقلی ہیں اس لئے رسول کا استنباط عقلی ہوگا اور جب رسول کا استنباط
ایسے امور میں عقلی ہے وحی یا الہام سے متعلق نہیں تو اور معصومین کا استنباط
بدرجہ اولی عقلی ہوگا - پس ثابت ہے کہ کل احکام قرآن کا علم بھی انہوں نے
قرآن سے بذریعہ عقل اکتساب کیا - کیونکہ یہی اکتساب بنائے فضیلت ہے - مجرد
وہبی علم بنائے فضیلت نہیں -

ایک سوال - احکام شریعت معصوم اور غیر معصوم دونوں سے یکساں
متعلق ہیں - ان احکام کا ظاہر و باطن ایک ہے - پھر حروف مقطعات میں جو تعلیم
ہے وہ صرف معصومین راسخون فی العلم سے کیوں مخصوص ہے - شریعت میں ایسی
کیا بات ہو سکتی ہے جو عوام امت سے مخفی رکھنا ضروری ہو

جواب - اول یہ کہ اوپر تصریح ہوئی کہ یہ حروف ماخذ احکام نہیں ہیں اور
چونکہ ان حروف مقطعات کی مراد کا علم نبی اور امام سے مخصوص ہے لہذا وہ ایسی
خصوصیات سے متعلق ہیں جو نبی اور امام میں مشترک ہیں - ورنہ اس تخصیص کی کوئی
وجہ نہیں ہو سکتی - وہ مشترک خصوصیات دو ہیں -

۱- قرآن و شریعت کا حامل و عالم ہونا نیز جماعت اسلامیہ کی اقامت میں رہبری
کرنا -

۲- دین کی حجت و تقویت کے لئے ایسے محل پر معجزہ دکھانا جو مناسب ہو چونکہ
متشابہات یعنی حروف مقطعات ماخذ احکام نہیں ہیں لہذا اول فریضہ سے ان کا تعلق

ان آیات میں حم بجنسہ چھ سورتوں میں آیا۔

الم ۔ چھ سورتوں میں

الرا پانچ سورتوں میں

طسم دو سورتوں میں

اگر مکررات کو چھوڑ دو تو صرف ۱۴ حروف مقطعات ہیں۔

۱۱	۱۰	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱
المرا	الرا	طس	طہ	کہیعص	یس	المص	ص	ن	ق	

۱۴	۱۳	۱۲
الم	عسق	حم

ابھی اوپر ذکر ہوا کہ خداوند عالم نے کتاب کو مثانی فرمایا ہے۔ یعنی ہر مطلب کو دو مرتبہ باختلاف عبارت بیان کرنے کا التزام ہے لہذا جن مطالب کو ان چودہ حروف مقطعات سے ظاہر فرمایا ہے وہ بھی باختلاف عبارت ان میں دو مرتبہ بیان ہوئے ہیں۔ پس اگر ہر مطلب اس طرح دہرایا ہوا ہے تو وہ دراصل سات مطالب ہیں جو ان چودہ حروف سے باختلاف حروف بیان ہوئے۔ اس لئے مطلب کے اعتبار سے یہ سات آیات ہیں جو ایسے علم کے حصول کا ذریعہ ہیں جن سے قوتِ اعجاز معصوم کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ کتاب کی اہم تر آیات ہیں اور ان کا نزول رسول کے لئے سبب خاص امتنان ہے۔ قرآن سے یہ آیات جدا اور متمائز ہیں اس لئے کہ قرآن کا اطلاق ان آیات پر ہے جن کی قرات کی جائے یعنی جو پڑھی جائیں۔ اور پڑھنے یا قرات کے معنی اہلِ عرب کے لئے معنی سمجھتے ہوئے پڑھنا کیونکہ عربی زبان کی ادا اہل عرب پر عادتاً عیاں تھی۔ لہذا حروف مقطعات پڑھے نہیں جاتے یعنی لغوی معنی سے ان کی قرات نہیں ہوتی۔ اسی لئے وہ قرآن سے جدا ہیں اس مطلب کو ذیل کی آیت میں بیان فرمایا ہے۔

حاصل ہو یا وہ اس سورہ کی بعض آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ان کے ساتھ مل کر اس علم پر دلالت کرتی ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اگر الم۔ حم۔ الرا خود اسی علم پر دلالت کرتیں تو ان کا پانچ چھ و سات سورتوں میں بار بار وارد کرنا عبث ہوتا بلکہ حروف مقطعات اپنے سورہ کی بعض آیات کی طرف مشیر ہیں جو کسی طرح اس علم پر دلالت کرتی ہیں۔

حروف مقطعات

قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں میں بسم اللہ کے بعد ایسی آیتوں سے ابتدا ہو رہی ہے جو زبان کے لفظ نہیں ہیں مجموعہ حروف یا ایک ہی حرف ہیں۔ ترکیب حرفی میں یہ اور آیتوں سے متشابہ ہیں اس لئے ان کو متشابہات سے تعبیر فرمایا ہے۔

ترتیب نزول کے اعتبار سے ان کی فہرست یہ ہے:۔

۱۔ سورہ قلم ۔ ن
۲۔ سورہ قاف ۔ ق
۳۔ سورہ ص ۔ ص
۴۔ اعراف ۔ المص
۵۔ یس ۔ یس
۶۔ مریم ۔ کہیعص
۷۔ طہ ۔ طہ
۸۔ شعرا ۔ طسم
۹۔ نمل ۔ طس
۱۰۔ قصص ۔ طسم
۱۱۔ یونس ۔ الرا
۱۲۔ ہود ۔ الرا
۱۳۔ یوسف ۔ الرا
۱۴۔ حجر ۔ الرا
۱۵۔ مومن ۔ حم
۱۶۔ حم سجدہ ۔ حم
۱۷۔ شوریٰ ۔ حم عسق
۱۸۔ زخرف ۔ حم
۱۹۔ دخان ۔ حم
۲۰۔ جاثیہ ۔ حم
۲۱۔ احقاف ۔ حم
۲۲۔ ابراہیم ۔ الرا
۲۳۔ سجدہ ۔ الم
۲۴۔ الروم ۔ الم
۲۵۔ عنکبوت ۔ الم
۲۶۔ بقر ۔ الم
۲۷۔ آل عمران ۔ الم
۲۸۔ رعد ۔ المرا
۲۹۔ لقمان ۔ الم

مقدم کیا ہے۔ وہ بمقابلہ مزید احسان و امتنان کا سبب ہیں۔ اور یہ اسی صورت میں ہوگا جب سبع مثانی قوت اعجاز کے حصول کا ذریعہ ہوں۔

سبع مثانی یا حروف مقطعات قوت اعجاز کے حصول کا ذریعہ ہیں

اس کی تائید یوں بھی حاصل ہے کہ معجزات رسل کی بھی سات ہی قسمیں ہیں۔ اور ان آیات میں ہر ایک سے ایک خاص نوع کی قوت حاصل ہے وہ انواع یہ ہیں:۔

۱۔ تصرف بر اجسام ارضی۔ جیسے آصفؑ کا تخت بلقیس کو ایک آن میں منتقل کر دینا

۲۔ تصرف بر ارواح ارضی۔ جیسے عیسیٰؑ کا مردہ زندہ کر دینا یا مٹی کے پتلے میں روح ڈال دینا۔

۳۔ خلق اعراض۔ جیسے موسیٰؑ کے ہاتھ میں روشن سپیدی کا پیدا کرنا۔

۴۔ خلق اجسام ارضی۔ جیسے آنحضرتؐ کی انگلیوں سے پانی پیدا ہونا یا مائدہ مسیحؑ۔

۵۔ تصرف بر اجسام سماوی۔ جیسے شق قمر۔

۶۔ تصرف بر ارواح سماوی۔ جیسے معراج میں آنحضرتؐ کا بذریعہ ارواح سماویہ عروج کرنا۔

۷۔ علم غیب پر دسترس۔

آیت میں ہے کہ آصفؑ کو کتاب سے ایک علم حاصل تھا اور وہ سب سے کم درجہ کا ظاہر ہوا۔ یعنی تصرف بر اجسام ارضی۔ ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے حصول کو ادنیٰ مدارج کی قوت اعجاز کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کو چار ابتدائی مدارج اس علم کے حاصل تھے۔ پانچواں درجہ حاصل نہ تھا جو تصرف بر اجسام سماوی ہے۔ کیونکہ جب آپ کی امت نے آسمانی معجزہ طلب کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس امت کو آسمانی معجزہ دیکھنا میسر نہ ہوگا۔ یعنی

واٰتیناک سبعا من	اور ہم نے عطا کیں تجھ کو سات
المثانی والقراٰن	دوہرائی ہوئی آیات
العظیم	اور قرآن عظیم۔

سات دوہرائی ہوئی آیات یہی چودہ حروف مقطعات ہیں سبع مثانی سے قرآن کی اور آیات یا سورہ فاتحہ مراد نہیں ہو سکتیں اس لئے کہ وہ قرآن کا جزء ہیں۔ اور کل اور جزء کا عطف جائز نہیں اور یہاں سبع مثانی اور قرآن معطوف ہیں یعنی ایک شے کا کل اور اس کا ایک جزء کسی جملہ میں لفظ "اور" سے نہیں جوڑ سکتے۔ اس لئے کہ وہ حشو قبیح ہوگا۔ جیسے عرب اور مدینہ میں کھجور پیدا ہوتا ہے۔ یہاں جب کل عرب کے متعلق کہا تو مدینہ جو جزء ہے اس کے متعلق بھی وہ بات کہدی گئی۔ پس مدینہ کا ذکر حشو قبیح ہے۔

یہاں سے اس اعتراض کا جواب ہوگیا کہ جب قرآن کو اللہ تعالیٰ نے مبین فرمایا تو اس کا ہر جزء یعنی مقطعات بھی مبین اور واضح الدلالت ہونا چاہئیں۔ جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کو اس آیت میں خداوند عالم نے جدا شے قرار دیا ہے اور حروف مقطعات جدا شے۔ لہذا قرآن کا ہر وصف ان کے لئے ثابت ہونا ضروری نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ طریقہ دلالت میں اور مطالب کے اعتبار سے ان کی نوعیت قرآن سے جدا ہے۔ اب اگر کہیں کہیں قرآن کا اطلاق کل کتاب پر معہ حروف مقطعات کے ہوا ہے تو وہ بقاعدہ تغلیب ہے۔ یعنی اگر کسی مجموعہ میں ایک نوع کی تعداد غالب و اکثر ہے تو اس مجموعہ کا نام اس نوع کے نام پر رکھ لیتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شہر میں نوے فیصدی انگریز آباد ہوں تو اس کو انگریزوں کا شہر کہتے ہیں۔ اس آیت کی دلالت پر غور کیجئے۔ اے رسول ہم نے تم کو دو چیزیں عطا کیں ایک سبع مثانی دوسرے قرآن عظیم (یہ کہنا درست نہیں کہ ہم نے عطا کیا تم کو ملک ہند اور بنگال اس لئے کہ بنگال ہند کا جزء ہے)۔ لہذا سبع مثانی قرآن سے جدا ہیں سبع مثانی کو قرآن پر

عبرانی حروف مقطعات یہ ہیں :۔

عبرانی حرف کی صورت	عبرانی حرف کا نام	مقابل عربی حرف
א	اَلِف	ا
ד	دالیتھ	د
ח	حے	ح
ט	تیتھ	ط
י	یوتھ	ی
פ	پے	ف
צ	سوادے	ص

توریت میں حروف مقطعات کہیں سورت کے ابتدا میں بھی ہیں اور کہیں انتہا میں۔ ہر ایک سورہ میں نہیں ہیں۔

حروف مقطعات کے بعض مزید فائدے

۱۔ قرآن میں حروف مقطعات کے وجود سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید لفظاً اور معناً کلام خدا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ معانی کا القا خدا کی طرف سے ہو اور الفاظ نبی کے ہوں۔

۲۔ سوروں کی ترتیب نزولی معین کرنے میں ان سے بھی مدد ملتی ہے ان کی فہرست اوپر دی ہے۔ اس پر نظر کرو تو ظاہر ہوگا کہ جن سورتوں میں ایک ہی حروف مقطعات ہیں جیسے حم تو وہ مسلسل ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ایسا سورہ نہیں جس کے حروف مقطعات دوسرے ہوں۔ یہی صورت الم والے سوروں کی ہے۔ یہی صورت ملتی جلتی حروف مقطعات والے سوروں کی ہے جیسے طہ۔

آئندہ امت سے یہ مخفی ہے۔ مرقس باب آیات ۱۰ اور ۱۱

۱۰۔ اور فریسی نمودار ہوئے اور یسوع (عیسیٰ) سے سوال کرنے لگے ایک نشان آسمانی طلب کیا۔ اس طرح اس کا امتحان لیا۔

۱۱۔ اور اس نے ایک گہری سانس لی اپنے نفس سے۔ یہ امت کیوں ایسا نشان طلب کرتی ہے؟ میں تم سے بہ تحقیق کہتا ہوں کہ اس امت کو کوئی ایسا نشان نہیں دکھایا جائے گا۔

قرآن مجید کے مقطعات کا توریت کے مقطعات سے مقابلہ

عجیب بات ہے کہ قرآن کے چودہ مقطعات چودہ ہی حروف سے مرکب بھی ہیں وہ یہ ہیں۔ ا۔ ہ۔ ح۔ ط۔ ی۔ ک۔ ل۔ م۔ ن۔ س۔ ع۔ ص۔ ق۔ ر

توریت کے حروف مقطعات کی ترکیب میں صرف سات حروف ہیں:-

ا۔ د۔ ح۔ ط۔ ی۔ ف۔ ص

حروف مقطعات کی یہ خصوصیت ہے کہ دونوں کتابوں میں ان کا انتخاب حروف اصلیہ سے ہوا ہے۔ یعنی ابجد۔ ہوز۔ حطی۔ کلمن۔ سعفص۔ قرشت تک ۲۲ حروف ہیں۔ یہ حروف عربی و عبرانی میں مشترک ہیں۔ عبرانی میں صرف یہی ۲۲ حروف ہیں۔ عربی میں۔ ثخذ۔ ضظغ۔ چھ زائد حروف ہیں۔ یہ حروف اصلیہ نہیں بلکہ حروف مستزادہ ہیں۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ عبرانی حروف کی صورت عربی حروف سے کسی قدر مختلف ہے اور ان کے ناموں میں بھی خفیف اختلاف ہے۔

مشکل الفاظ کی شرح

ابتلا ۔ آزمائش۔ سخت مشکلوں میں کام کرنا۔

اتباع ۔ پیروی

اتصاف ۔ صفت بیان کرنا

احاطہ کلیات :۔ عام تصورات جیسے انسان حیوان کا سمجھنا۔

احکام فرعیہ :۔ شریعت کے وہ قواعد جو اعمال سے متعلق ہیں۔ جیسے نماز۔ نکاح۔ میراث۔

اخوت :۔ بھائی ہونا

ادراک :۔ کسی امر کا سمجھنا، خواہ عقل سے یا حواس سے۔

ادراک جزئیات :۔ افراد کا ادراک

ادراک حسی :۔ حواس سے کسی شے کا علم۔

ارتقا :۔ تدریجی ترقی

اسالیب :۔ جمع اسلوب کی بمعنی طریقہ یا وضع۔

استبعاد :۔ بعید از قیاس ہونا

استقرا :۔ کسی نوع کی افراد پر نظر کر کے نوع کے لئے کوئی بات ثابت کرنا۔

استکمال نفس ۔ اپنی ذات یا نفس کو کامل بنانا۔ یعنی علمی و اخلاقی ترقی۔

استمرار ۔ مسلسل جاری رہنا

اسفل السافلین ۔ نیچے سے نیچا درجہ۔

اشتغال ۔ مشغول ہونا

اشعہ ۔ جمع شعاع کی۔ کرن

اعراض ۔ جمع عرض کی۔ جو صفت یا علاقہ کسی ذات میں قائم ہو جیسے سپیدی یا حرکت۔

افادہ ۔ فائدہ پہونچانا۔

افعال اضطراری ۔ جو کام یا حرکت بے اختیاری سے ہو۔

افعال معکوس ۔ تحریک سے جو فعل بلا ارادہ واقع ہوں جیسے گدگدانے سے ہنسنا۔

اقتصاص ۔ پہلے کہی ہوئی بات کو یاد دلانا۔

اقتضا ۔ کسی شے کی طبیعت کا تقاضا۔

اقتصادیات ۔ وہ علم جس میں

طس ۔ طسم کردہ مسلسل ہیں ۔ الرا چار مسلسل سورتوں میں ہے ۔ لیکن سورہ ابراہیم
ان سے دور اور منقطع جا پڑا ہے جس سے اس کا مقام مشکوک ہے ۔ ترتیب
نزول چونکہ تصریف آیات سی بھی معین ہوتی ہے اور اخبار سے بھی اس لئے
تمام شواہد پر نظر کر کے یہ فیصلہ کرنا باقی ہے کہ سورہ ابراہیم کا مقام کہاں ہے ۔

گذارش

ناظرین غور سے ملاحظہ فرمائیں کہ آیات متشابہہ کے متعلق جن آیات کی تفسیر
ہم نے کی ہے اس میں ہر لفظ اور جملہ کی مراد پورے طور پر معین اور ثابت کر دی ہے ۔
اور ہر خلاف احتمال کا باطل ہونا عیاں کر دیا ہے اس طرح قرآن کا جامع ومانع
ہونا ظاہر ہوا ۔ چنانچہ تفسیر قرآن میں آگے نظر آئے گا کہ ہماری تفسیر اسی طریقہ پر ہے
کسی کلمہ یا کلام کی تعبیر کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کلمہ یا کلام کا مفہوم یا مصداق
معین کیا جائے ۔ مثلاً زید نے انتقال کیا ۔ اب یہ بتانا کہ "انتقال کیا" کا مفہوم ہے
"مر گیا" ہے اور زید کے متعلق یہ بتانا کہ وہ حارثہ کا بیٹا تھا اور آنحضرت صلعم کا متبنیٰ
تھا لفظ زید اور انتقال کا مفہوم و مصداق معین کرنا ہے ۔ حروف مقطعات کی
تعبیر اسی معنی سے حرام کی گئی ہے کہ ان کے مفہوم یا مصداق کا معین کرنا جائز نہیں
لیکن یہ بتانا کہ حروف مقطعات کلام میں حکیم مطلق کا اس لئے ان کے معنی ہیں اور
کوئی ان کا مخاطب ہے یہ تعبیر نہ ہوئی ۔ نہ یہ بتانا کہ معصوم کے حصول قوت اعجاز
میں ان کو دخل ہے تعبیر ہوئی ۔ لیکن یہ کہنا کہ یہ اللہ کے نام ہیں ان کا مصداق
بتانا ہے اس لئے تعبیر ہوئی یا یہ مختصر عبارات ہیں (ABBRVRATION:)
الف سے اللہ م سے محمد اور ل سے جبرئیل مراد ہیں مصداق بتانا ہے اس لئے
تعبیر ہے ۔ اگر کوئی کہے کہ یہ رموز و اشارات ہیں جو نبی کو کئے گئے تو یہ تعبیر کلام نہ ہوگی ۔

تفریع ۔ کسی اصول سے کوئی شاخ پیدا کرنا۔
تکلیف حسنہ ۔ ایسی تکلیف دینا جو باعتبار نتیجہ کے اچھی ہو۔
توضیح مقال ۔ بات کو واضح کر دینا۔
تہافت ۔ ایک بات کہہ کر اس کے خلاف کہنا۔
ثابتات ۔ وہ چیزیں جو مطلقاً متغیر نہیں ہوتیں۔
جازم ۔ قطعاً یقینی۔
جامع و مانع ۔ ایسا کلام جس کے الفاظ معنی کو پورا پورا ادا کریں اور کسی زائد مطلب پر دلالت نہ کریں۔
جاودانی ۔ ہمیشہ رہنے والی۔
جبری ۔ جو جبر کا قائل ہو
جزو لا یتجزی ۔ ایسا حصہ جو تقسیم نہ ہو سکے۔
جزو لا ینفک ۔ کسی شے کا وہ جزو جو اس سے جدا نہ ہو سکے۔
جوارح ۔ جمع جارحہ کی یعنی عضو
جوہر ۔ وہ شے جو قائم بالذات ہو۔
حجت بالغہ ۔ قاطع دلیل۔

حرکت طوافی ۔ ایک شے کا دوسرے کے گرد گھومنا۔
حشو قبیح ۔ کلام میں بلا ضرورت الفاظ لانا۔
حقیقت حسیہ ۔ وہ امر جو حواس سے معلوم ہو۔
حصر ۔ کسی امر کا کسی فرد یا نوع میں پایا جانا اور اس کے علاوہ نہیں۔
خلود ۔ ہمیشہ رہنا۔
خیر مطلق ۔ وہ ذات جس میں ہر خوبی بدرجہ کمال ہو۔
دواعی فعل ۔ وہ امور جو کسی کام کا سبب ہوں۔
دلائل قطعیہ ۔ یقینی دلیلیں
دنائت ۔ پستی۔ کمینہ پن۔
راجع ۔ رجوع کرنے والا۔ کسی کی طرف آنے والا۔
رد و قدح ۔ اعتراض کرنا
رؤف ۔ مہربان
ریاضت ۔ محنت و کوشش
زجاج ۔ شیشہ
زجر ۔ ڈانٹ پھٹکار
ساقط الاعتبار ۔ ناقابل اعتبار

مال و دولت کی پیدا ہونے اور صرف کی بحث ہو۔

اکتساب۔ حاصل کرنا۔ کمانا

التزاماً۔ کسی بات کا ضرور کرنا یا ہونا۔

الغیب۔ وہ ذات جو حواس سے محسوس نہ ہو۔

الوہیت۔ معبود کے موجود ہونے کا اعتقاد۔

امتداد زماں۔ ایک زمانہ گزرنے پر۔

امتزاج۔ دو یا زیادہ چیزوں کا مل جانا اس طرح کہ مرکب کا ایک مزاج قائم ہو جائے۔

انفعال۔ کسی پر کسی اور کا عمل واقع ہونا۔ رد عمل۔

انفکاک۔ جدا ہونا۔

انہدام۔ منہدم ہونا

اہرمن۔ پارسیوں کا وہ خدا جو شر کی علت ہے۔

بالاستحقاق۔ حق کے ساتھ

بالتصریح۔ صاف بیان

بالجزم۔ پورے یقین کے ساتھ

بدیع۔ کلام کی کوئی خوبی

بدیہی۔ جو بات اس طرح عیاں ہو کہ ثبوت کی ضرورت نہ ہو۔

بذل۔ صرف کرنا

بہائم۔ جمع بہیمہ کی۔ چوپائے۔

بین بنفسہ۔ ایسا کلام جس کے معنی عیاں ہوں۔ غور کی ضرورت نہ ہو۔

تاثیر۔ ایک شے کا دوسری شے پر اثر کرنا۔

تاثر۔ اثر قبول کرنا

تتبع۔ تلاش و طلب

تجرید ذہنی۔ کسی شے کی صفت کو اسکی ذات ذہن میں جدا کر لینا۔

تحدیث۔ بات کرنا۔

تحییز۔ جگہ گھیرنا۔

تصدیق کلیہ۔ وہ عام بات جو کسی قسم کی کل افراد کے لئے ثابت ہو۔

تصور کلی۔ کسی نوع کا تصور۔

تضمناً۔ ضمن بیان میں۔

تضعیف۔ کمزور قرار دینا۔

تعبیر۔ کلام کے معنی بیان کرنا۔

تغلیب۔ بڑے حصہ پر کل کا اطلاق کرنا۔

لزوم ماہیت۔ وہ امور جو کسی شے کی ماہیت کو لازم ہیں۔

ماذون۔ جسے کو اذن یا اجازت دی گئی ہو۔

مالایطاق۔ جو کسی کے بس کے باہر ہو۔

مالہٗ۔ جو امر کسی قضیہ کے موافق ہو

ماعلیہ۔ جو امر کسی قضیہ کے مخالف ہو

ماہیت۔ کسی شے کی نوع

مایحتاج۔ جس چیز کی حاجت ہو

مبدا۔ آغاز۔ علت آغاز

متالم۔ جو الم میں ہو۔

متعین۔ جو مقرر ہو۔

مترقب۔ جس کی توقع ہو۔

متضاد۔ وہ امر جو دوسرے کی ضد ہو۔

متضائف مفاہیم۔ وہ دو تصور جن میں کا ایک بغیر دوسرے کے ذہن میں نہ آئے۔

متضمن۔ جو کلام سے ضمناً حاصل ہو۔

متمکن۔ جس کے لئے کوئی کام کام کرنا ممکن ہو۔

متمم۔ پورا کرنے والا۔

مجہول المعنی۔ جسکے معنی نہ معلوم ہوں

محاسن۔ جمع حسن۔ خوبیاں

محجوج۔ جس پر حجت پوری کر دی گئی ہو

محرکات۔ فعل۔ فعل کے سبب

محصور۔ وہ امر جس کا حصر کسی صورت سے کر دیا گیا ہو۔

محاط۔ جس کا احاطہ کر لیا گیا ہو۔

موضوع۔ جس کی بابت قضیہ میں کچھ کہا گیا ہو۔

محمول۔ جو کچھ موضوع کے بارہ میں کہا گیا۔

مختتم۔ ختم کر دینے والا۔

مدبر۔ انتظام کرنے والا

مدلول۔ جس بات پر دلیل لائی گئی ہو۔

مربوب۔ جس کی تربیت کی گئی

مربی۔ تربیت کرنے والا

مربوط۔ ربط دیا ہوا۔

مرجع۔ جو بات کہنا تھی

مرفوع۔ رفع کیا ہوا

مزاولت۔ بار بار کسی کام کو کرنا

مزخرف۔ باطل

سفاہت ۔ بیوقوفی سبکی
سوق ۔ بہاؤ ۔ درخ
سیاق و سباق ۔ CONTEXT
صعب ۔ مشکل
صنعت ترصیع ۔ عبارت کا ہم وزن جملوں پر مشتمل ہونا ۔
ظن ۔ گمان
عاری ۔ خالی ہونا کسی وصف
علف زار ۔ سبزہ زار
علم الجو ۔ METEOROLOGY
علی الاتصال ۔ لگاتار
عمل بالجوارح ۔ وہ کام جو ہاتھ پیر یا اعضا سے کیا جائے ۔
غائب علی الاطلاق ۔ وہ ذات جو کسی طرح بھی حواس سے محسوس نہ ہو
غایت ۔ غرض ۔
غیر النہایت ۔ جس کی حد نہ ہو
غیر مستدل ۔ وہ دلیل جو مطلوب کو ثابت نہ کرتی ہو ۔
فارق ۔ فرق کرنے والا ۔
فصل ممیز ۔ وہ امر جو ایک نوع کو دوسری نوع سے جدا کرے
فہم عامہ ۔ COMMON SENSE

قائم بالذات ۔ وہ شے جو موجود ہونے میں محل قیام کی محتاج نہ ہو جیسے پتھر چاندی ۔
قائم بالغیر ۔ وہ شے جو موجود ہونے میں کسی دوسری شے میں قائم ہو ۔ جیسے سپیدی ۔
قبیح ۔ مذموم
قدری ۔ جو انسان کو فاعل مختار مانتا ہو ۔
قضیہ ۔ کوئی جملہ جس میں کسی بات کی نفی یا اثبات ہو ۔
قضیہ شرطیہ ۔ جس میں ایک شرط کے ساتھ نفی یا اثبات ہو ۔
قطع ۔ پورا یقین ۔
قوائے فطریہ ۔ وہ قوتیں جو فطرت یا نیچر میں عمل کر رہی ہیں ۔
قیاس اقترانی ۔ CATEGORICAL SYLLOGISM
قیاس مع الفارق
باوجود فرق کے ایک شے کے حال کا دوسری کے حال پر قیاس کرنا ۔
کارہ ۔ کراہت کرنے والا ۔
لزوم ۔ ایک چیز کا دوسری کو لازم ہونا

مہتدی ۔ جو ہدایت پر ہو

مہجور ۔ متروک

ناقص الدلالت :۔ جو کلام اپنا
مطلب پورا ادا نہ کرے ۔

نظر غائر :۔ غور سے نظر کرنا ۔

نظری :۔ وہ بات جس کی صحت
معلوم ہونے کو دلیل ضروری ہو ۔

نقطہ مماس :۔ وہ نقطہ جس پر
دو جسم ملتے ہوں ۔

وثوق وثاقت :۔ صحیح ہونا، درستی

وجدان :۔ نفس کو براہ راست
کسی شے کا علم بلا واسطہ حواس یا عقل
جیسے نفس کو اپنے الم یا سرور کا علم ۔

وحدت وجود :۔ یہ اعتقاد کہ
سوائے ذات باری اور کوئی موجود نہیں
ہے ۔

وضعی :۔ بنایا ہوا

وعد :۔ بشارت ۔ ثواب

وعید :۔ عذاب کی خبر

مسائل نظری ۔ وہ باتیں جن پر دلیل لانا ضروری ہو
مسبب جس کا سبب ہو۔
مستجمع صفات کمال جسکی ذات میں ہر صفت کمال جمع ہو
مستطیع تحقیق ۔ جسکو تحقیق کرنے کی قوت ہو اور اسباب موجود ہوں
مسلمات ۔ وہ باتیں جو تسلیم کرلی گئی ہوں۔
مشروط ۔ جس کے ہونے کی کوئی شرط ہو۔
مطروح جسکو نظر انداز کیا گیا
معارف ۔ بلند مطالب
معارضات ۔ وہ امور جو کسی بات کے مخالف ہوں۔
مغالطہ ۔ دلیل میں غلطی کا ہونا
مطلق العنان ۔ بالکل آزاد
معاقدت ۔ کسی کے ساتھ عہد کرنا
مغائر ۔ جدا ۔ غیر متعلق
مفاہیم عقلیہ ۔ وہ تصورات جو عقل سے حاصل ہوں جیسے علت و معلول ۔ لازم و ملزوم

مفروضات جو باتیں فرض کر لی گئی ہوں۔
مقسوم ۔ جو شے تقسیم کی گئی
مکتسبہ اہلیت ۔ وہ لیاقت جو خود حاصل کی ہو۔
مکلف ۔ ذمہ دار بنایا ہوا
مماثل ۔ مانند
مماثلت نوعیہ ۔ وہ یکرنگی جو ایک نوع کی افراد میں ہوتی ہے ۔
مناقشہ ۔ بحث کو طول دینا
منزل من اللہ ۔ اللہ کا نازل ہوا
منشاء انتزاع ۔ وہ شے جس سے دوسری شے پیدا ہو۔
منعکس ہونا ۔ روشنی کا ایک جسم پر پڑ کر پلٹنا ۔
منتہیٰ ۔ انجام
منصوح ۔ جس کو نصیحت کی گئی ہو
منضم ۔ ملا ہوا ۔
منقاد ۔ مطیع
موجود فی الخارج ۔ جو ذہن سے باہر عالم میں موجود ہو۔
منقطع ۔ کٹا ہوا ۔ جدا
موقنین ۔ یقین کرنے والا۔

پرنٹر پبلشر:- سید علی صمد صاحب نیو قادری پریس، ۹ مورلینڈ روڈ
بمبئی ۸ سے چھپوا کر ادارہ ادب و دانش ۳، بی جوبلی بلڈنگ
سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے شائع کیا۔

مختصر فہرست مضامین جلد ۲